اکبر جے پوری

بکھرے موتی

اکبر جے پوریؔ

BIKHRAY MOTI

بکھرے موتی

اشاعت : 2012ء

ترتیب : سید شبیر حسین جے پوری،
سید سلیم جے پوری، سید ظہور جے پوری

کمپیوٹر کمپوزنگ : سید ضمیر اندرابی

قیمت : Rs.350/-(تین سو پچاس روپے)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ وفات

عالم الفاضل الادیب جناب آغا سید اکبر حسینیؒ جے پوری مورخہ ۴ ماہِ ذی قعدہ

۱۴۱۸ھ مطابق ۴ مارچ ۱۹۹۸ء چارشنبہ

گُل زِ گلزار حسینیؒ خوشنما خوش بوسُمن　　رفت بباغِ ارم ہمچو گلاب و یاسُمن

سیّدِ والانسب بالب شکر شیریں زبان　　شاعرِ عرفانِ والا شان ادیبِ زمن

آہ سیّد اکبر حسینیؒ فرزندِ سیّد علیؒ　　صاحبِ فضل وعمل آموزگارِ علم وفن

از فراقش در مکاتیبِ ادب آمد خلاء　　شمعِ محافل شعراء رونقِ اہلِ سُخن

وقتِ رحلت شد بہر جا شورشِ ماتم بپا　　چشمِ ہاتر خاک برسر چاک شدہ پیرہن

داغِ حسرت در گلستانِ ادب دائم دنہاد　　بُلبلاں از ماتمش در لالہ زاراں نغمہ زن

ربع ذیقعدہ ہزار وچار صد وہشت ودہ　　کرد و داغِ گلستانِ جہاں سرو چمن

چار مارس یکہزار ونہصد ونود وہشت　　ہمنشینِ جدِّ پاکش شُد بارحتِ کفن

مرحبا طیرِ فضاءِ علم با عالی مقام　　آشیاں فردوسِ اعلیٰ زیرِ سایۂ پنجتنؑ

از قلمِ سید ابوالحسن موسوی ضیغم

غرضِ تالیف

بارشوں اور تُند و تیز ہواؤں کے بیچ اُڑنے والی نازک اور رنگین تتلی کی طرح
ہمارے والِد محترم جناب اکبر جے پوری مرحوم نے اِس دنیائے آب وگل
میں اپنی زندگی گزارنے کی سعی کی۔ لیکن چرخ بریں کی بے نیازیت اور
گردشِ دوران کی بے مروتی انہیں بالکل راس نہ آئی۔ جوان کی نازک مزاجی
اور جوانی کی رعنائیوں پر براہِ راست اثر آفرین ہوتی رہی۔ وہ صاحبِ علم،
حلیم طبیعت، فقیرانہ خصلت اور صوفی مزاج کے پیکر تھے۔ نہایت سادگی اور
مُنکسیر المزاجی اُن کا پیرہن تھا۔ جوانی اور لڑکپن جے پور میں گذارا۔ وہیں
تعلیم پائی پھر حالات نے وارِدِ کشمیر ہونے پر مجبور کردیا۔ جواُن کا اصلی وطن
تھا۔ یہاں وادئی کشمیر کی پُر فریب فضاؤں، پہاڑوں اور مرغزاروں نے انہیں
ادب اور شعروشاعری کی طرف اورزیادہ مائل کردیا۔ بے شمار ادبی سرگرمیوں
اور شعری اصناف پرزورآزمائی نے اُنہیں تھوڑا سا سکون میسر کیا۔ کتابیں ان
کی ساتھی تھیں۔ دوست واحباب کے ساتھ خط وکتابت کے ذریعہ قرب
حاصل تھا۔ ٹیلی فون نہ ہونے کے برابر تھے اس لئے ہمیشہ دوستوں اور ادبی
ہمعصروں کو خطوط لکھا کرتے تھے اور اُن کے جوابات کا بڑی بے صبری سے

انتظار کرتے تھے۔ اُن کا حلقہ احباب بڑا وسیع تھا۔ یہاں تک کہ دوسرے ممالک سے بھی خطوط آیا کرتے تھے۔ اُن کے قدردانوں نے اُنکے متعلق مضامین اور نظمیں لکھیں۔ جو مختلف رسالوں اور اخباروں میں مختلف شہروں میں رونق قرطاس بن گئیں۔ ہم نے حقوق پردی ادا کرنے کی غرض سے ان مضامین کو یکجا کیا اور کتابی شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی حقیر کوشش کی۔ اس اُمید کے ساتھ کہ اُن کی روح ہم سے راضی رہے۔ اور قارئین بھی اُن کی زندگی کے چند ایک گوشوں سے واقف ہوں ہم ان تمام دوستوں، بزرگوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے ہمیں اس کام میں کسی بھی طرح کی مدد فرمائی۔

سید سلیم جے پوری

حسن آباد رعناواری

پروفیسر عبدالقادر سروری

صدر شعبۂ اردو

جموں و کشمیر یونیورسٹی

سرینگر۔

اکبر جے پوری کشمیر کے اردو شعرا میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ وہ اتنے عرصہ سے اس میدان میں کہ کہنہ مشق شاعر بھی کہلا سکتے ہیں۔ ان کی فکر کا میدان کافی وسیع ہے۔ غزل، سلام، مرثیہ، اور نظم ہر ایک صنف میں ان کا کلام موجود ہے۔ لیکن غزل کی طرف ان کی توجہ زیادہ رہی ہے اور اس مقبول صِنف میں انہوں نے کافی سرمایہ اِکٹھا کر دیا ہے۔ غزل میں وہ تغزّل کی قدیم روایت کے پابند ہیں اور اس روایت کو اس طرح زندہ کیا ہے کہ ان کی غزل پڑھتے ہوئے ہم اپنے آپ کو لکھنو کے متاخر دور کے شعراء کی فضا میں پاتے ہیں۔ ہمارے اپنے عہد میں اس رسم کُہن کا زندہ کرنا آسان کام نہیں تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر صاحب نے اس طرزِ خاص کے اساتذہ کا مطالعہ بڑی توجہ اور دِل

دِہی سے کیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کی غزل بھی تغزل کے انہیں معیاروں پر پہنچ گئی ہے تاہم وہ ہماری صدی کے شاعر ہیں ہمارے اپنے مسائل ہیں جو براہِ راست یا بہ واسطہ ہمارے لکھنے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔ اس میں خیالات اور اسالیب دونوں ہی شامل ہیں۔ ایسی مثالیں اکبرؔ صاحب کی غزلوں میں ملتی ہیں۔ اُن کی غزل کے کچھ شعر ہیں جن میں ان کی ذات کی انفرادیت یا عصری تقاضوں کی جھلک ملتی ہے: مثلاً ۔

انسان حقیقت تھا، انسان فسانہ ہے
وہ اور زمانہ تھا، یہ اور زمانہ ہے

ترے کوچہ میں آنکھیں دیکھتی ہیں
صِفت سنتے تھے جو باغِ جناں کی

ہر شام کے پردے میں، ہوتی ہے سحر پنہاں
مرنا بھی حقیقت میں، جینے کا بہانہ ہے

ڈوبنے والے ہی اب تہہ کا پتہ کچھ دیں تو دیں
ناخُدا تو عُمر بھر ارمانِ ساحل میں رہا

ہر طرف پھیلا ہوا ہے حُسن کا دامِ فریب
پاؤں اس وادی میں رکھنا، دیکھ اے دِل دیکھ کر

زندگی جس کو زندگی کہئے
میری قسمت میں عمر بھر نہ ہوئی

تغزل میں بھی ہم کو کچھ نئے اسلوب اور انداز مل جاتے ہیں: مثلاً

گُد گُدا کر آپ دل کو ناخُنِ شمشیر سے
ہر دہانِ زخم کا پھر مُسکرانا دیکھئے

اے دل نہ جائے ہاتھ سے میدانِ اضطراب
بحث آپڑی ہے برق سے اے جانِ اضطراب

مُجرمِ عشق ہوں، مگر ایسا
حُسن بھی جس کو پارسا جانے

اوپر کی مثالوں میں فکر کے کچھ گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں اور اسلوب شعر بھی پسندیدہ ہے اور بیان میں استعارہ کا انداز، جو ادب کی مقبولیت کا اہم جُز ہے، اِن اشعار میں موجود ہے۔ ان میں شاعر نے کچھ مسائل پیش کئے ہیں ان کے مقابل میں بعد کے دو شعر تغزل کے ہیں، تاہم اُن کے انداز میں بھی نُدرت

موجود ہے۔ ذیل کے شعر محض روایت کے پابند ہیں اور ایسے شعر جگہ جگہ مِل جاتے ہیں:۔

جہاں میں دھوم ہے حُسن بُتاں کی
یہ ہے شوخی مرے طرزِ بیاں کی

لحاظِ خاطرِ صیاد ہے جو اِس طرح چُپ ہوں
قفس کو توڑ کر کیا مُجھ کو اُڑ جانا نہیں آتا

بتا اے حُسن، کس نے سبزہَ وگُل کو جلا ڈالا
اگر جلوؤں کو تیرے، آگ برسانا نہیں آتا

یہ زبان اور بیان ہر لحاظ سے اچھے شعر ہیں تاہم یہ روایت قدیم کے پابند ہیں۔ ایک اور بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ غزل کے اِس انداز میں ایک ہلکا پھلکا پن ہے جو عام قاری کے ذہن کو زیادہ متاثر کرسکتا ہے۔ شاید اکبرؔ کا یہ شعر اسی طرف اشارہ ہے۔۔

گواہی دے رہا ہے گلستانِ شاعری اکبرؔ
کہ میری طرح سب کو پھول برسانا نہیں آتا

میرا خیال یہ ہے کہ غزل میں شاعر کی شخصیت جو دب جاتی ہے نظموں میں نِکھر آئی ہے۔ نظمیں اکبرؔ نے کئی لکھی ہیں۔ ان میں کچھ نظمیں کشمیر کے مناظر پر

ہیں۔ جیسے جنت کاشمر، اور کسی حد تک، تنظیم نو بہار، یہ کشمیر پر لکھی ہوئی بے شمار نظموں کا ایک جز ہیں۔ کچھ نظمیں واقعات، حادثات، یا اشخاص پر ہیں، شہیدانِ وطن کی یاد'' تجدیدِ عہد'' ''کلچرل اکادمی کا افتتاح'' جولائی 1959 کا سیلاب، اور شاعرِ کشمیر مہجور کی یاد میں'' اسی طرح کی نظمیں ہیں۔ ''جنت کشمیر'' فارسی میں لکھی ہے۔ اس نظم میں اس گُل زمیں کے بارے میں شاعر کے جذبات اُبل پڑتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:۔

روکشِ انہارِ فردوس آبشار کاشمر
نازشِ گُلزارِ جنت، لالہ زارِ کاشمر
نخلِ طوبیٰ پست از شاخِ چنار کاشمر
فرعِ سدرہ شرمگیں از برگ و بارِ کاشمر
سرنگوں شد آسماں زیں گلستانِ بے خزاں
حوضِ کوثر آب آب از رود بارِ کاشمر

سیلاب والی نظم میں، جہلم کی طغیانی سے جو تباہ کاری ہوئی تھی اس کی اچھی تصویر پیش کی ہے۔ اس نظم کے کچھ شعر ہیں:۔

خوننابہ ریز کیوں ہے مری چشمِ تر نہ پوچھ
وجہ شکستگیِ دل نوحہ گر نہ پوچھ
پنہاں مرے سکوت میں ہے داستانِ غم
جس کو بیاں میں نہ کرسکوں وہ خبر نہ پوچھ

گرداب زندگی میں کچھ اس طرح گھر گئے

ڈوبے ہوئے اُبھر نہ سکے عمر بھر نہ پوچھ

طوفانِ نوحؑ بن گیا جہلم کا پیچ و تاب

کیسا زمانہ ہوگیا زیر و زبر نہ پوچھ

مہجورؔ کشمیر کے سربرآوردہ شعرا میں سے تھے اکبؔر کی نظم مہجور پر ان کی فکروفن کے بارے میں ان کے ہم وطن شاعر کا خراجِ تحسین ہے۔ یہ نظم اکبؔر کی اچھی نظموں میں سے ہے۔

سلام اکبؔر نے کافی تعداد میں لکھے ہیں۔ لیکن اُن کی مرثیہ نُما نظمیں، اس سلسلہ کی نظموں میں ایک نُدرت کی حامل ہیں۔

مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اکبؔر کا یہ مجموعہ شائع ہونے جارہا ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس کی اشاعت سے کشمیر کے یا کشمیر سے متعلق شعرا کے شعری مجموعوں میں ایک اچھا خاصہ اضافہ ہوجائے گا۔

سری نگر (کشمیر) ۵/ اکتوبر ۱۹۶۵ء

عبدالقادر سروری

(ساز شکستہ میں شائع شدہ)

☆☆☆

تعارف ......اپنی زبان میں

اکبر جے پوری

غالبًا چودہ پندرہ برس کا سن ہوگا کہ مجالس عزا میں بینیہ اشعار سُنانے اور ماتمی دائروں میں نوحے پڑھنے کا شوق تھا جس نے میرے سیدھے سادے خیالات کو سوز ونیت کی شکل دی۔ ہائی اسکول اور کالج میں میگزین کی ادارت نے کچھ کہہ لینے اور شائع کرانے کی ترغیب دلائی۔ مشاعروں میں ہلڑ مچانے اور دِل بہلانے کیلئے ہم سِن لڑکوں کی ٹولی کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک طرحی مشاعرہ میں چند اشعار سُنائے تو حوصلہ بڑھا۔ جے پور کی ادبی فضا میں مشاعرے سال میں دس بارہ ہوا کرتے تھے۔ ہر مشاعرے میں شمولیت کو اپنا معمول بنالیا۔ عام طور پر طرحی مشاعروں کا رواج تھا۔ ایک مشاعرہ میں اپنے ہمسایہ اُستاد، امامِ فن، ناظم الملک سید معشوق حسین اطہرؔ ہاپوڑی نے پہچانا اور گھر بُلایا۔ بد نصیبی سے یہ شرفِ تلمذ دو سال سے زائد قائم نہ رہ سکا اور گردِش تقدیر مجھے اپنے آبائی وطن کشمیر لے آئی۔ شاعری کا سودا سر میں سمایا ہوا تھا لیکن کوئی رہنما نہ ملا۔ ظاہر ہے ایسے ماحول میں پنپنے والی شاعری ادبی معیار پر کیسے پوری اُتر سکتی ہے؟ ہر قدم پر لغزشوں کا ڈر، ہر گام پر ٹھوکر کا خطرہ۔ پھر بھی دل کے بے پناہ جذبات مجھے مجبور

کرتے رہے اور میں شاعری کی پُرخار وادی میں صحرا نوردی کرتا رہا۔ نہ کسی مقام کا پتہ، نہ کسی منزل کا نشاں بس ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح کبھی جنتِ کشمیر کے کسی دل فزا مقام کی منظر کشی پر مائل ہوا تو کبھی زندگی کے کسی تلخ تجربہ نے خونِ جگر کو اشعار کی صورت میں برسانے پر مجبور کیا۔ کشتی حیات شباب کے بھونر میں پھنسی اور ہچکولے کھانے لگی تو جوانی کی پُرکیف راتوں کو ایسے نغموں کی تخلیق کے نذر کیا جو ہر جوان دل کے دھڑکن کی غماز بنیں۔ کتابِ دل کی دل نشیں تفسیریں لکھتا رہا اور خوابِ جوانی کی تعبیروں میں کھویا ہوا زُلف و رخسار کی شاعری میں محو ہوگیا۔ اگر چہ اس کتابچہ میں آپ کو اس دورِ رنگیں کی خرافات کا نام ونشاں نہیں ملے گا کیونکہ اس قسم کی شاعری کی اشاعت کو مناسب نہیں سمجھتا۔ ہاں اس دور کے 2 دیرپا اثرات کا ذکر ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ نوجوان طبقہ میں میری مقبولیت بڑھی، میرا کلام ریاست کے اخباروں کے علاوہ ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہونے لگا۔ دوسرا اثر یہ ہوا کہ میری مشقِ سُخن جو صرف قافیہ پیمائی تک محدود تھی تنگنائے غزل سے ذرا وسیع تر میدان میں داخل ہوئی۔ رفتہ رفتہ جذبات کے متلاطم سمندر میں سکون سا آنے لگا۔ جنونِ شاعری تو کم نہ ہوا لیکن طرزِ فکر میں خفیف سی تبدیلی آنے لگی۔ فکرِ جمیل خوابِ پریشان بن گئی اور سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہوتے ہوئے بھی روایاتِ قدیم سے کبھی کبھی انحراف کی جسارت کرنے لگا۔ غمِ جاناں غم دوراں کے سانچے میں ڈھل کر میٹھی میٹھی کسک اور ہلکی ہلکی خلش سے دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ بیان وزباں میں سنجیدگی سی آگئی اور واردات قلبی میں ایک قسم کا ٹھہراؤ سا محسوس ہوا۔ تجرباتِ حیات نے خیال ونظر کو وسعت عطا کی۔

داخلی ہیجان پر خارجی عوامل اثرانداز ہونے لگے اور میرا خیال ہے کہ میری شاعری شعور وادراک کے ایک ایسے موڑ پر پہنچی جہاں اس پر زندگی کی ترجمانی کا الزام لگایا جاسکے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ محفلوں اور مشاعروں کی ہنگامہ آرائیوں میں سکونِ دل کی تلاش کرتا رہا اور انجمن ترقی اردو کی ریاستی شاخ کے معتمد کی حیثیت سے بیسیوں مشاعرے اور ادبی جلسے منعقد کئے۔ جلسوں کی کاروائیوں اور مشاعروں کے انتخابات کو اپنے اخراجات پر شائع کرا کے مفت تقسیم کرتا رہا۔ اردو کے نام پر کچھ شوقِ نمود تھا لیکن خدمت زبان وادب کا پُرخلوص جذبہ بھی ایثار و انہماک کا باعث بنا رہا۔ علی گڈھ اور دہلی جا کر انجمن کے کُل ہند جلسوں میں ریاست کی نمائندگی کی۔ ریاست اور بیرون ریاست کئی کُل ہند مشاعروں میں شمولیت کی۔ مشاہیر ادب کے روبرو کلام سنایا سخن فہموں سے داد پائی۔ ہر اجتماع میں نہ صرف زینتِ محفل رہا بلکہ شریکِ شورشِ محفل بھی رہا۔ درجنوں احباب کو لکھ کر دیا اور وہ عوام سے شاعری کی سند پاتے رہے۔ بہت سے مانگ کر لے گئے۔ کئی ایک نے فرمائشی نظمیں لکھوائیں اور کچھ کرم فرما اُڑا لے گئے اور بڑی ہی خوش اخلاقی سے اپنا لیا۔ لیکن میرے کلام کا زیادہ حصہ میری عدم توجہی اور لااُبالی پن سے ضائع ہوگیا۔ ایک تو اس خیال سے کہ کوئی قابلِ قدر سرمایہ نہیں، میں نے حفاظت نہیں کی دوئم یہ گمان نہ تھا کہ کبھی ایسا وقت آئے گا کہ ماضی کے افکار پریشاں کو دیکھنے کا شوق ہوگا اور منتشر اوراق کی ترتیب و تالیف کی ضرورت کا خیال آئے گا۔ سازِ دل خاموش ہوگیا تو اس کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو جوڑ کر کچھ دِلدوز نغمے سنانے کی تمنا دل میں کروٹیں لینے لگی۔ اپنے حافظ پر زور دے کر جو

کچھ یاد آیا لکھ دیا، کچھ بکھرے ہوئے کرم خوردہ اوراق کو کھنگالا، اس طرح ایک ضخیم دفتر اِکٹھا ہو گیا، گویا آشیاں اُجڑنے کے بعد منتشر تنکیوں سے طرح نو ڈالی۔ یہ مجموعہ مجھے بہت عزیز ہے دست بردِ زمانہ سے جو کچھ بچا ہے باقیات الصالحات سمجھتا ہوں لیکن اس کی تدوین و اشاعت کیلئے زرِ کثیر درکار ہے۔ انتخاب کی الجھنوں میں مہینوں پھنسا رہا۔ بہت سے محترم شعراء کرام سے امداد چاہی لیکن کسی نے ہاتھ نہ بٹایا، اپنی پسند و ناپسند کو معیار بنانا چاہا لیکن ناکام رہا۔ ناچار اس احتیاط کے ساتھ کہ بساطِ سیاست پر بدلتے ہوئے مہروں کی واضح نشان دہی سے دامن بچا رہے کچھ نظمیں چُن لیں۔ حالانکہ ۱۹۴۷ء سے آج تک وطنِ عزیز کی بدلتی ہوئی حالتوں کی بہت سی حسین دلکش تصویریں اپنے نکتۂ نظر کے مطابق کھینچی ہیں اور اس دورِ انقلاب کی تقریباً تمام خونیں داستانوں کو دامانِ شاعری پر سجایا ہے لیکن ابھی اُن کا منظرِ عام پر لانا خلافِ مصلحت ہے۔ غزلیں اور وہ بھی ساری روایتی اور قدیم رنگ کی سیکڑوں ہیں جن کا انتخاب میرے امکان سے باہر ہے چند ایک شامل ہیں۔ مذہبی نظموں کا ذخیرہ بھی کافی ہے کیونکہ میری شاعری کی ابتدا اِسی سے ہوئی ہے اور آج جبکہ آفتاب زندگی لب بام آ گیا ہے میں اسے وسیلۂ نجات سمجھتا ہوں اور زیادہ تر رجحان اسی طرف ہے اس لئے اس حصہ میں سے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کتابچہ کی ضخامت کی تنگ دامانی کے پیشِ نظر دو چار سلام تبرّکاً پیش ہیں۔

اکبرؔ جے پوری

۳/جون ۱۹۷۴ء

اکبر جے پوری کی شاعری

......ایک مطالعہ......

(جناب پریمی رومانی، ایم اے پی ایچ ڈی)

اکبر جے پوری سرزمین کشمیر کے اُن گِنے چُنے شعراء میں سے ہیں جنہوں نے اردو شاعری میں اپنے میٹھے لہجے سے ایک الگ مقام بنایا ہے۔ اُن کی آواز اگرچہ بعض جگہوں پر تھکی تھکی سی معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں نغمگی اور لوچ برابر قائم ہے۔ اُن کی شاعری میں جہاں پیکر تراشی کے عمدہ نمونے ملتے ہیں وہاں اُن کا اسلوب لہجے کا انفرادی پن اور بیان کا سادہ انداز بھی متاثر کرتا ہے۔ اکبر کی شاعری میں خوف، دہشت، شام، سمندر، موت، خلا، غم، دھواں وغیرہ ایسے بہت سے الفاظ بار بار ملتے ہیں جنہیں وہ علامتوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اکبر جے پوری غم کے شاعر ہیں۔ شاید اس کا سبب اُن کی اپنی زندگی ہے۔ اُن کی ذاتی زندگی غم والم کی ایک کھُلی کتاب ہے۔ اس غم والم کو وہ ہنس ہنس کر سہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہ اسی غم کا اعجاز ہے کہ اُن کی شاعری میں درد وغم کی آگ سلگتی ہوئی محسوس کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب ''چند تحریریں'' میں رقمطراز ہیں:

''اکبر جے پوری نے اپنے شعر و نغمے سے ایک ایسی فضا قائم کرلی ہے جو مُسکراہٹوں اور خوشبوؤں کا نور بکھیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ دُنیا نے اُن پر کتنے ہی ستم کئے ہوں لیکن انہوں نے خونِ جگر جلا کر اپنے فن کے چراغ کو روشن رکھا ہے اور یہی اُن کے فن کی زندگی کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔''

اکبر جے پوری ہر صِنفِ سُخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن بُنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں نئی فکری رجحانات کا سلسلہ ملتا ہے۔ وہی اُن کی شاعرانہ عظمت کا راز ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے روایتی غزل سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔ وہ کلاسیکی غزل سے اس قدر آشنا ہیں کہ اُنکی شاعری میں بھی کہیں کہیں اُس کا پرتو نظر آتا ہے۔ اکبر کی غزل قدیم خمیر سے ضرور ہم آہنگ ہے لیکن اِسے اب انہوں نے نئے جذبات و احساسات سے مالا مال کیا ہے۔ اِسی لئے اُن کی شاعری قدیم اور جدید خیالات کا اِمتزاج لئے ہوئی ہے۔ عشق چونکہ اکبر جے پوری کی شاعری کا ایک خاص علامتی پہلو کا حامل ہے۔ بعض جگہوں پر انہوں نے اس کا ذکر روایتی انداز سے کیا ہے۔ اُن کا عشق کبھی آگ بن کر برستا ہے اور کبھی اندر ہی اندر سُلگ کر خاکستر ہونے کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ عشق کے یہی مِلے جُلے تاثرات اُن کی شاعری کے حامل ہیں۔ وہ کبھی فرہاد کی طرح جوئے شیر نکالنے پر کوشاں ہوتے

ہیں اور کبھی ماڈرن عاشق بن کر محبوب کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ اس ضمن میں اُن کے چند اشعار پیش کیۓ جاسکتے ہیں:۔

دل بھی گیا، جگر بھی گیا، جان بھی گئی!
میں نے دیارِ عشق میں سب کچھ گنوالیا

اللہ رے جنوں یہ تیری پردہ داریاں
چاکِ جگر کو چاک گریباں بنادیا

سب ایک ہی گلشن کی چٹکی ہوئی کلیاں تھیں
وہ حسن میں پور تھے، میں عشق میں پورا تھا

جاوِداں ہیں عشق کی گُل کاریاں
موت میں بھر دیا رنگِ حیات

دل کو دنیا میں جب سکوں نہ ملا
موت سے ہوگیا وہ ہم آغوش

مجرمِ عشق ہوں مگر ایسا!
حُسن بھی جس کو پارسا جانے

اکبرؔ جے پوری کے عشق میں ٹھٹھرنے کی کیفیت نہیں۔ اس میں ہر وقت حرارت اور گرمی باقی رہتی ہے۔ عشق کے علاوہ وہ غم والم کی بھی اپنی شاعری میں مُرقع کاری کرتے ہیں۔ اکبرؔ نے اپنی ساری زندگی تلخیوں میں گذاردی ہے۔ وہ دوسروں کے غم کو بھی اپنا ہی غم تصور کرتے ہیں۔ اگر چہ اُن کی زندگی غم، تلخی اور درد و کسک کی مِلی جُلی داستان ہے لیکن پھر بھی وہ ہنستے ہوئے اس شدید غم کا مقابلہ کرنے کیلئے چوکنا رہتے ہیں۔ اس تلخیٔ حیات نے اُن کی شاعری میں نئی روح پھونک دی ہے۔ اُن کی غزلیں پڑھ کر ایک نئے عزم و ارادے کا احساس ہوتا ہے۔ اکبرؔ کی شاعری میں محرومی، یاس، درد و کسک اور حسرت اور مایوسی کے ہلکے پھلکے تاثرات کے ساتھ ساتھ کامرانی اور شجاعت کے جذبات بھی پائے جاتے ہیں۔ اُن کا ایک ایک شعر معنی خیز ہوتا ہے۔ غم اور عشق دراصل وہ اپنی شاعری میں علامتوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان دو علائم کے بغیر اُن کی شاعری بے رنگ سی دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے چند اشعار جن میں محرومیٔ حیات بھی ہے اور درد و کسک کے عمدہ نمونے بھی:۔

زندگی جس کو زندگی کہیئے
میری قسمت میں عمر بھر نہ ہوئی

سب سے کہہ دیں گے ہم، کہ عشقِ صنم
اب کوئی بندۂ خدا نہ کرے

اس لئے گِن رہا ہوں تاروں کو
داغِ دل کا شمار آجائے

ان کے ہاتھوں میں پھول کے گجرے
میرے ہاتھوں میں دل کی تھالی ہے

گلے لگنے سے پہلے ہی لچک کر ہوگئی دوہری
تمہاری تیغ تو تم سے بھی بڑھ کر نازنیں نکلی

اکبر جے پوری نے اپنی شاعری میں جہاں روایات کے سرچشمے تازہ کئے ہیں وہاں عصری تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ کر شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ اردو شاعری کے قدیم کلاسیکی سرمائے کے مطالعے کے ساتھ ساتھ جدید شعراء کے کلام کے مطالعے نے بھی ان کے ذہن کو کُشادہ بنادیا ہے۔ اردو کے مشہور نقاد و محقق پروفیسر عبدالقادر سروری اُن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”اکبر جے پوری ہماری صدی کے شاعر ہیں۔ ہمارے اپنے مسائل ہیں جو براہِ راست یا بلا واسطہ ہمارے لکھنے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔ اس میں خیالات اور اسالیب دونوں ہی شامل ہیں۔ یہ تمام چیزیں اکبر کی غزل گوئی میں نظر آتی ہیں۔ اُن کی غزل کے کچھ شعر ہیں جن میں اُن کی ذات کی انفرادیت یا عصری تقاضوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ بعض جگہوں پر فارسیت کا غلبہ پایا جاتا ہے جس سے اُن

کے کلام میں تھوڑا سا بھاری پن نظر آتا ہے۔ایک اور چیز جو کہ اُن کی شاعری میں ملتی ہے وہ ہیں گھسے پٹے مضامین، جو بعض جگہوں پر کھٹکتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے اُن کی غزلوں کے چند اشعار جن میں روایت سے ہٹ کر مضامین باندھ لئے گئے ہیں:۔ مثلاً

انسان حقیقت تھا انسان فسانہ ہے
وہ اور زمانہ تھا، یہ اور زمانہ ہے

آپ کا نام جانِ گلشن ہے
آپ کی بات ڈالی ڈالی ہے

چند ہی اشکوں سے ہوتی ہے شبِ غم بیدار
چند ہی کرنوں سے تقریبِ سحر ہوتی ہے

ایک طوفان سا بہہ رہا ہے
آنکھوں کا عجیب ماجرا ہے

مدت سے دل کا شہر ہے ویراں پڑا ہوا
اُجڑے ہوئے خیال کا نقشہ لئے ہوئے

اکبر جے پوری کا مشاہدہ وسیع ہے۔اسی مشاہدے نے اُن کی غزلوں میں نیا رنگ نیا آہنگ پیدا کیا ہے۔ اُن کی غیر معمولی ذہانت اور احساسِ جمال کی لطافت نے اُن کی شاعری کو نکھار بخشا ہے۔اکبر جے پوری سلیس اور رواں الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہیں جن سے اُن کے کلام میں تغزل درد واثر، گُداختگی، سوز و گداز، کیف و سرمستی اور کسک پیدا ہو جاتی ہے۔

اُن کی غزلوں میں پیکر تراشی کے اعلیٰ ترین نمونے، خیالات کی فراوانی، خواب پرستی کا سا رجحان، علامت نگاری اور مترنم لہجہ بھی پایا جاتا ہے۔ ؎

اشک بن کر بہہ گئے، چار قطرے تھے لہو کے
میری کشتی کیلئے طوفان کام آ ہی گیا

کاٹ ڈالے ہم نے ہنس ہنس کر مصائب کے پہاڑ
زندگی کا بوجھ گویا، امتحانِ دوش تھا

دل کی جانب رُخ ہوا ہے آج اُن کے تیر کا
حوصلہ بڑھنے لگا ہے عاشق دلگیر کا

اللہ رے جنوں پہ تیری پردہ داریاں
چاکِ جگر کو چاکِ گریباں بنا دیا

سیکڑوں ماہتاب نکلیں گے
چیر کر دیکھ آفتاب کا دل

اکبر جے پوری کی نظمیں بھی اپنی جگہ ایک انفرادیت رکھتی ہیں لیکن اُن کی

غزلوں میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ اُن کی نظموں کا بھی طرّہٗ امتیاز ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ جنت کشمیر، تنظیم نو بہار، شہیدانِ وطن کی یاد، تجدید عہد، شاعرِ کشمیر مہجور کی یاد میں، نعرۂ انقلاب، اہلِ وطن کے نام، شبِ شالیمار، چاندنی رات میں جھیل ڈل کا نظارہ، اظہارِ محبت، چند حسین یادیں، تصور، میں کون ہوں، وغیرہ نہ جانے کتنی نظمیں انہوں نے تخلیق کیں۔

جنت کشمیر، تنظیم نو بہار، شاعر کشمیر مہجور کی یاد میں شبِ شالیمار، چاندنی رات میں جھیل ڈل کا نظارہ جیسی نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر جے پوری کے دل میں غم اور عشق کی دہکتی آگ کے ساتھ ساتھ وطنیت اور قومیت کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ حالانکہ متذکرہ بالا نظمیں اکبر کے ابتدائی دور کی نظموں میں سے ہیں۔ لیکن پھر بھی اُن میں حُسن، لطافت اور خوب صورتی کے ساتھ ساتھ انفرادیت باقی ہے،۔ اِن نظموں کے مطالعہ کے بعد اکبر کی شاعری میں منظر کشی، مصوّری اور حسّیاتی محاکات کے نمونے ملتے ہیں اور ان کی آواز بہ حیثیت نظم گو کے دور سے پہچانی جاتی ہے۔ ان نظموں میں تغزل اور نغمگی کے ساتھ ساتھ شعر و موسیقی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اُن کی نظم نگاری کے بارے میں اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں رقم طراز ہیں کہ:۔

''نظمیں اکبر نے کئی لکھی ہیں۔ اِن میں کچھ نظمیں کشمیر کے مناظر پر ہیں۔ جیسے جنتِ کاشمیر اور کسی حد تک تنظیم نو بہار، یہ کشمیر پر لکھی بے شمار نظموں کا ایک جُز ہیں، اُن کے مطابق اکبر کی شاعرانہ شخصیت کچھ حد تک اُن کی غزلوں میں دب

جاتی ہے اور اُن کی نظموں میں نکھر آتی ہے۔

چند مثالیں:۔

شیخ اور برہمن کو بغلگیر دیکھئے

اس آئینہ میں صورتِ کشمیر دیکھئے

آزادئی چمن پہ غزل خواں ہے عندلیب

گُل چیں ہے دل گرفتہ و دلگیر دیکھئے

(تنظیم نو بہار)

سینچا ہے اپنے خوں سے گلستانِ کاشمیر

لاکھوں سلام تُم پہ شہیدانِ کاشمیر

ہر برگ گُل، مُرقّعِ قوسِ قزح ہے آج

نِکھرا ہے رنگِ خونِ جوانانِ کاشمیر

تاریخ انقلاب میں سمٹے ہو اس طرح

یادیں اُبھر کے بن گئیں طوفانِ کاشمیر

(شہیدانِ وطن کی یاد)

اے وطن کی آبرو، اے شاعرِ جنت نشیں!

تیرے نغموں سے خجل، نغماتِ فردوسِ بریں

تیرے سازِ دل پہ نغمے حافظ شیراز کے

تیری غزلوں میں نئے تیور نیاز و ناز کے

جذبۂ دل تو نقاب شعر میں مستور تھا
قلب مضطر جلوۂ دیدار سے پُر نور تھا

(مہجور کی یاد میں)

اکبؔر جے پوری کی نظموں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کشمیر کی تاریخ دہرائی گئی ہے۔ کشمیر کے باغات کی تعمیر میں قدیم بادشاہوں کا حصہ، کشمیری شعرا کا تذکرہ، کشمیر کے پہاڑوں اور ندی نالوں اور جھرنوں کا تواریخی پس منظر، ۱۹۵۹ء کے سیلاب کی تباہ کاریاں، قدیم لوگوں کی زندگی اور ان کے رہن سہن کا ڈھنگ وغیرہ ایسے بہت سارے اہم واقعات اکبؔر جے پوری کی نظموں میں نظر آتے ہیں جن سے کشمیر کی اخلاقی قدریں، یہاں کی سیاسی اور ثقافتی زندگی کے اہم مرقعے سامنے آتے ہیں: مثلاً

یہ جھیل عشق ونغمہ کا مسحور کن نشان
اس سے عیاں ہے حبّہ ویوسف کی داستان
بڈشاہ کے جزیروں کی یہ جھیل رازداں
تاریخ کاشمیر کی خاموش ترجمان
ہے آستانِ حضرت بل اسی سے ہمکنار
اس آستان کا روپ ہے، تقدیس کی بہار
گلپوش شالیمار ونشاط ونسیم ہیں
یہ سب ثبوت لُطف خدائے کریم ہیں

ہیں تازگی بدوش، اگرچہ قدیم ہیں
سچ پوچھیے تو حُسن ازل کے ندیم ہیں
سیاح کی نگاہ کا تارہ یہ پھول ہیں
اِک سیلِ رنگ و بو کا نظارہ یہ پھول ہیں

حضرت اقبال دارد نسبتے با خاکِ پاک
ہست زین العابدین ہم نامدارِ کشمیر
مومنؔ و سرشار بود از مشاہیرِ وطن
للّہ وجہؔ ہم انداز افتخارِ کشمیر

اکبرؔ جے پوری نے غزل نظم وقطعات ورباعیات کے علاوہ کافی تعداد میں سلام، بھی لکھے ہیں جن کی علمی وادبی دُنیا میں پذیرائی ہوئی ہے۔ اکبرؔ کا سب سے بڑا امتیاز اُن کے لہجے کی انفرادیت اور لفظ ومعنی کا خوب رچاؤ ہے۔

(مطبوعہ دوماہی تعمیر سرینگر جلد نمبر ۲۰)

بوئے خلوص کا متلاشی

(ڈاکٹر برج پریمی)

ریڈر، شعبۂ اردو،

(کشمیر یونیورسٹی، سرینگر)

کوئی پچیس سال پہلے کی ایک سہانی دوپہر اس وقت بھی میرے ذہن کے کواڑ پر دستک دیتے دیتے رُک گئی ہے۔ خلا کو گھورتی ہوئی میری بے قرار نگاہیں ہائی اسکول رنگہ ٹینگ کے ایک چھوٹے سے کمرے کے باہر دالان میں جم گئی ہیں۔ کوئی لہک لہک کر اقبالؔ کے شعر پڑھ رہا ہے اور پھر بڑی رسیلی آواز میں بڑے بلیغ انداز سے ان کی تشریح کر رہا ہے۔ آواز کا زیر و بم اس قدر گرفت میں لینے والا ہے کہ میرے قدم ٹھٹھک جاتے ہیں۔ شعر کو پڑھنے اور پڑھانے کا وہ البیلا انداز اس وقت بھی میرے اندر کہیں محسوس ہو رہا ہے۔

گھنٹی بجکر سیاہ شیروانی میں ملبوس ایک لمبے پتلے، گھنے سیاہ گھونگر والے بالوں والے ایک وجیہ حسین نوجوان سے ملاقات ہوتی ہے۔ بالوں سے خوشبو کی لپٹیں آ رہی ہیں اور یہی خوشبو اُن کی باتوں سے بھی آہستہ آہستہ بکھر رہی ہے۔

اکبر جے سے یہ میری پہلی ملاقات تھی!

اکبر سے یہی ملاقات کچھ عرصے کے بعد دوستی میں بدل گئی۔ میں نے اُن کو مختلف منزلوں پر مختلف چہروں میں دیکھا اور میرا یہ خیال یقین میں بدل گیا کہ اکبر خلوص اور دوستی کا زندہ جاوید پیکر ہے۔ بہت سال بعد جب اکبر اور میں چند اور دوستوں کے ساتھ ماہنامہ ''دیش'' کے ادارۂ تحریر کے ساتھ کچھ عرصہ کے لئے وابستہ ہوگئے تو نہ صرف یہ کہ میں ان کی محبت کا قائل ہوگیا بلکہ اُن کی جگر کاوی اور اردو دوستی سے بے حد مرغوب ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ یہ شخص اردو کی محبت کیلئے اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔

اکبر ایک عجیب اور پُر اسرار شخصیت ہے۔ ایک زمانے میں وہ بذاتِ خود ایک ادارہ تھے۔ ''انجمن ترقی اردو'' کی کشمیر شاخ کے سیکریٹری کی حیثیت سے انہوں نے قابلِ قدر کام کیا۔ حالانکہ اُن کے ساتھ تعاون کرنے والے گنتی کے چند افراد ہی تھے۔ بعض معترفین کہا کرتے تھے کہ یہ صرف ون مین شو (one man show) ہے۔ لیکن اس ایک آدمی اور اِن تقریبوں میں جو سلیقہ اور رکھ رکھاؤ ہوا کرتا تھا وہ صرف اکبر جے پوری جیسا آدمی ہی کرسکتا تھا۔

مجھے ایس پی کالج میں منعقد ہوئے کتنے ہی ''یومِ اقبال'' اور ''یومِ غالب'' یاد ہیں جہاں اقبال اور غالب پر مقالے پڑھے جاتے۔ شعروشاعری ہوتی اقبال اور غالب کا کلام سُنایا جاتا اور اس سب کے پس منظر میں کالی شیروانی میں ملبوس وہی جانا پہچانا جسم ناتواں کام کرتا تھا۔ اکبر کی شخصیت کا اسرار اس بات میں چھپا

ہوا ہے کہ وہ کشمیری ہوتے ہوئے بھی جے پوری ہیں اور جے پوری ہوتے ہوئے بھی کشمیری۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جے پورا کبر کی شخصیت کا ایک اہم حصہ ہے۔

اکبر کی ہر ادا نرالی ہے وہ آپ سے صرف اردو میں گفتگو کرے گا۔ حالانکہ اُن کا ماحول کشمیری ہے۔اُن کے یار دوست، بیوی بچے سب کشمیری بولتے ہیں۔ یہ اُن کی ریا کاری نہیں بلکہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اردو اکبر کے خون میں گھلی ہوئی ہے۔ اکبر چائے، پان خوشبو اور مسکراہٹ کا یہ امتزاج اکبر کی زندگی کا حاصل ہے۔ جو میں نے زندگی کے ہر دور میں اُن کے ہاں پائی ہے۔ اُس زمانے میں بھی جب وہ گھنٹوں میجسٹک ہوٹل میں چائے کی چسکیاں لیا کرتے تھے اور اُس زمانے میں بھی جب نامساعد حالات نے اُن کو اپنے حصار میں بند کر کے اُن کا گلا گھونٹ لیا تھا۔

اکبر نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ایسے ماحول میں گھرا ہوا پایا جہاں افلاس کے سائے منڈلا رہے تھے۔ کارزارِ حیات میں وہ کتنی ہی آزمائشوں اور کم نصیبیوں میں گھر گئے۔ اس کا ذکر نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔ عزیزوں اور دوستوں کی نوازشیں بند ہوگئیں۔ الزام تراشیوں کے انبار لگ گئے اور سماجی زندگی میں جو وقار انہیں حاصل تھا وہ ان سے چھین لیا گیا۔ کوئی اور ہوتا تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا ہوتا۔ لیکن اکبر سخت جان ہے۔ انہوں نے زندگی اور معاشرے کی عفونتوں کا ایک مردِ مجاہد کی طرح مقابلہ کیا۔ ہزار بار موت کے دہانے تک چلے

گئے لیکن ہر بار موت کو جُل دے کر واپس لوٹ آئے ہیں۔ اُن کی گردن میں کبھی خم پیدا نہ ہوا۔ اُن کی مُسکراہٹ کبھی مر نہ سکی۔ اس بات کے باوجود کہ کبھی کبھی اُن کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ میں نے اُن کے چہرے پر تکان کے آثار دیکھ لئے تو مجھے اُن کی آنکھوں میں کتنے ہی نا آسودہ ارمانوں کی چتائیں سُلگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اکبؔر ایک شفیق باپ، ایک ذمہ دار شوہر، ایک پیارا دوست ...... میں کٹ کے رہ گیا۔ لیکن آہستہ بہت ہی آہستہ سے انہوں نے اپنے سر کو جھٹک دیا۔ پپڑے جمے ہوئے ہونٹوں پر ایک نہایت ہی پیاری مُسکراہٹ کِھل اُٹھی، شوخ، چنچل، بے باک مُسکراہٹ۔ ٹوٹ کر بھی زندہ رہنے کی غماز! لُٹ کر بھی فراخ دلی، خلوص اور محبتوں کی خوشبو بکھیرتی ہوئی۔ مجھے میری مُراد مل گئی۔ اکبؔر نے تیرہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا تھا اور جب سے اب تک انکے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی ہے۔ وہ ہمارے یہاں کے اردو شاعروں میں شاید سب سے زیادہ زود گو ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آج تک اُن کا صرف ایک شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ وہ بیسیوں مشاعروں میں شریک ہوئے ہیں اور اپنے سدا بہار شعروں سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اکبؔر نے ہر طرح کے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کے یہاں غزلیں بھی ملتی ہیں اور نظمیں بھی۔ قطعات، رباعیات، نعت، سلام، نوحے، قصیدے، سب طرح کی چیزیں اُن کی آرٹ گیلری میں نظر آئیں گی۔ اُن کے ابتدائی کلام پر رومان کی گہری چھاپ ہے۔ اکبؔر خود اِس دشت سے گُزرے ہیں۔ لہٰذا اُن کی آواز میں آورد نہیں آمد ہے۔ اُن

کی قلبی واردات، اُن کے اپنے احساسات کا فطری اظہار ہے۔ محبت ازل محبت ابد! یہاں اُن کا انداز بالکل روایتی شاعر کا ہے۔ وہی عہد و پیمان وہی ہجر کی راتوں کا ملال، وہی محبوب کے کوچے میں زندگی بسر کرنے کی آرزو؛ ان اشعار میں شعر کی مٹھاس کے علاوہ کچھ اور نہیں ملتا۔ پھر بھی بعض جگہوں پر ایسی باتیں ایک نئے انداز میں کہی گئی ہیں کہ نظریں ٹھٹھک جاتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

اُس کو بُجھا سکا نہ سیلابِ اشک بھی
دل میں وہ ایسی آگ لگا کر چلے گئے

اُلفت بھری نگاہ میں شرم و حیا کا رنگ
وہ راز دل کو مجھ سے چھپانے پھر آ گئے

لپٹا کے میری قبر کو کہتے ہیں ناز سے
لو اُٹھو ہم نے اپنا دردِ محبت بڑھا لیا

کچھ آنسو تھے، آہیں تھیں، کچھ غم تھے زمانے کے
یہ میری محبت کا انجام تھا، حاصل تھا

لیکن بعد کی غزلیں نکھری ہوئی ہیں۔ اُن میں نہ صرف شانِ تغزل ملتی ہے۔

بلکہ ان میں ایک منجھا ہوا شعور بھی جھلکتا ہے۔ یہ غالباً اُس دور کی شاعری ہے جب اکبرؔ عشق اور رومان کے کارزار سے گزر کر مصائب کے صحراؤں میں پڑاؤ ڈالتے ہوئے سکون کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ عشق کے تیور یہاں کچھ اور بتا رہے ہیں۔ یہاں وہ بے قراری نظر نہیں آتی بلکہ جفاؤں کو سہتے سہتے جو ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہوتا ہے اُسی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ غزلیں ردیف وار ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ؎

جفاؤں پر تُجھے ہے ناز، تو مجھکو وفاؤں پر
مگر تیری طرح اے حُسن، اِترانا نہیں آتا

اُفق پر رات کی تاریکیوں کا پہرہ ہے
مگر میں صبح کے منظر، تلاش کرتا ہوں

دل ہی نہ ہو تو عشق کے ارماں ہیں سب فضول
یوسفؑ نہ ہو تو مِصر کا بازار کیا کریں

صنم پُرانے ہیں، ذوقِ نظر بھی کُہنہ ہے
نئے خیال کے آذر تلاش کرتا ہوں

سنتے نہیں وہ عرض تمنا تو غم نہیں
اس مختصر سی بات پر تکرار کیا کریں

وہ اور ہوں گے آگیا غش جن کو طور پر
جھپکی نہ اپنی آنکھ تو دیدار یار سے

اکبر نے کافی نظمیں بھی کہی ہیں۔ مجھے بعض اوقات لگتا ہے کہ وہ غزل سے نظم زیادہ بہتر کہہ لیتے ہیں۔ یہاں وہ کھُل کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کا بیانیہ انداز، اُن کا ذوقِ نظر، اُن کی پیکر تراشی اور پھر درد و گداز میں چھیڑتی ہوئی ان کی لَے ایک سماں پیدا کرتی ہے۔

''زنداں سے خط کا جواب'' ''زنداں کی شب مہتاب'' ''اظہارِ محبت'' ''ایک خواب'' ''پیامِ عَمل'' ''شب شالیمار'' ''چاندنی رات میں جھیل ڈل کا نظارہ''۔ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:۔

تم مرا غم نہ کرو، غم کی کوئی بات نہیں
قیدِ تنہائی نے ہی مُجھ کو دیا رازِ حیات
خوش ہوں میں آج، ریا کاروں سے محفوظ تو ہوں
رُوح کے گیت سُناتا ہے مجھے سازِ حیات
آج کی دنیا میں نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور میرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

(زنداں سے خط کا جواب)

اِن اشعار کے پسِ منظر میں ایک زندانی کا چہرہ صاف جھلکتا ہے۔ جس کے دل میں کوئی ملال نہیں ہے۔ اپنی صداقتوں کی آگہی ہے جو دنیا اور دنیا والوں کے جذبۂ ادراک رکھتے ہوئے بھی محبت کی قندیل فروزاں کئے ہوئے ہے۔ ان میں ایک صاف و پاک، معصوم اور بے ریا فن کار کا صداقت کے تب وتاب سے دمکتا ہوا وجود واضح طور پر نظر آتا ہے۔ یا پھر زنداں کی اس کال کوٹھری میں جب چاند کی کرنیں جھلمل جھلمل اُتر کر اُس کے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں تو فن کار اکبر دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ اور کلپناؤں کے جلوۂ صد رنگ میں بہتے ہوئے کسی اور دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اُن کی محرومیاں اُن کا منہ چڑھانے لگتی ہیں۔ ان کا احساس کر کے درد کی ٹیس اُن کے دل میں ابھرنے لگتی ہیں۔ لیکن پھر اُن کا عرفان آڑے آتا ہے۔ دیکھئے اس کیفیت کا اظہار کیسے ہوتا ہے:۔

جانے کس حال میں ہیں، میرے جگر کے ٹکڑے
اے میرے چاند، کبھی اُن کی سحر تو ہوگی؟
ناوک اُفگن تری کرنیں نہ ہوں اُس کے دل پر
کوئی بھی جس کا سہارا نہ رہا میرے بعد
اُس کے جی پر جو گزرتی ہے کہے وہ کس سے
کون پوچھے گا اُسے تیرے سوا میرے بعد
حق پرستی کے سبب طوق وسلاسل میں اسیر
بے گناہی کے سوا کچھ بھی نہ تھا جرم اُن کا

تھی خطا اتنی کہ رکھتے تھے وہ اک زندہ ضمیر

اِک اُبلتا ہوا لاوا ہے میرے سینے میں

میری ہر سانس میں اِک شعلۂ جوالہ ہے

گو میں سقراط نہیں پھر بھی صداقت کیلئے

زہر کو آبِ بقا میں نے بنا ڈالا ہے

(زنداں کی شبِ مہتاب)

اور آخر میں شاعر کو یقین ہے کہ یہ تاریکیاں چھٹ جائیں گی اور ایک درخشاں صبح نمودار ہوگی۔ یہ صبح شاعر کی صبح ہوگی۔ اکبرؔ خود اس صبح کی بشارت دیتے ہیں:۔

خاک ہو جائے گا اک روز یہ تیرہ ماحول

سطحِ آفاق پہ کرنوں کا شجر اُبھرے گا

ڈوب جائیں گے شبِ غم کے یہ بوجھل سائے

مطلعِ وقت پہ خورشیدِ سحر اُبھرے گا

(زنداں کی شبِ مہتاب)

اکبرؔ کی نظموں میں آرزوؤں کے کتنے ہی پھول نظر آتے ہیں۔ کھلے ادھ کھِلے، مُرجھائے، خوشبو سے مہکتے ہوئے ان پھولوں کی دنیا کتنی عجیب ہے۔ اپنی آرزوؤں کے اظہار کیلئے جب وہ پس منظر کا ذکر کرتے ہیں تو اکبرؔ کی بیانیہ شاعری ایک نیا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

کبھی یہ جھیل بھی ہمدوش حوضِ کوثر تھی
کبھی یہ جھیل تھا آئینہ دستِ فطرت کا
ہوائیں کیف بداماں تھیں مست لہریں تھیں
تھا عکس عکس میں اِک نور حُسنِ قدرت کا
کسی حسیں کے آنچل کا خوبرو سایہ
چراغ تھا کہ ستارہ بساطِ عظمت کا
یہ راستہ کبھی شاداب تھا شگفتہ تھا
مگر ہے آج یہاں ایک مہیب ویرانی
نہیں یہ خط، کوئی ریگ زار ہے شاید
یہ چاند جیسے ہے کوئی ملول دوشیزہ
یہ جھیل اُس پہ چمکتی سی چاندنی کی رو
ہے چاندنی کی رِدا، جھیل کا کفن گویا
سرورِ جلوۂ گلزار، کس نے چھینا ہے
میری امیدوں کے پھولوں میں تازگی ہی نہیں
ملا تھا مجھ سے چناروں کی چھاؤں میں کوئی
میری نظر میں کہیں اب وہ زندگی ہی نہیں
یہ رات کیف بداماں تھی کل، مگر اب تو

یہ ہر نفس مجھے تاریکیاں ڈراتی ہیں

(ایک رات)

خدا کے واسطے تقدیسِ عشق کا دامن
اپنے دستِ ستم نہ تار تار کرو
فلک نہ ٹوٹ پڑے، اک قیامت آ جائے
یہ اتہام کے رستے نہ اختیار کرو
نوائے بُلبلِ خنداں کو لوٹنے والو
جمالِ حسن مکمل کا احترام کرو
خدا کا قہر، ٹوٹے، تمہارے ذہنوں پر
وقارِ عشق کا بھی کوئی احترام کرو
تو تغافل پہ نہ جا میرے، یہ عادت ہے میری
بھول جاتا ہوں میں خود کو بھی کبھی تیری قسم
میں تو اک رند ہوں بس تیرے ہی میخانے کا
اب نہیں مجھے وابستگی دیر و حرم

(ماحول سے بغاوت)

اِن تمام باتوں سے قطع نظر اکبر کے کلام کا وقیع حصہ واقعات کربلا سے متعلق ہے۔ اس حصے میں سلام، نوحے، مراثی، منقبت وغیرہ سب کچھ شامل ہیں۔ یہ حصہ بڑا جاندار ہے اور حضرت امام عالی مقام کے تئیں اکبر کے والہانہ جذبات

عقیدت کا پُرخلوص نذرانہ ہے۔ ان اشعار میں اکبر کے فنی کمال کا مطالعہ کافی دلچسپ ہے۔

اکبر جے پوری نے اپنے شعر و نغمے سے ایک ایسی فضا قائم کی ہے جو مسکراہٹوں اور خوشبوؤں کا نور بکھیرتی ہوئی اُڑتی چلی جاتی ہے۔ دنیا نے اُن پر کتنے ہی ستم کئے ہوں لیکن انہوں نے خونِ جگر جلا کر اپنے فن کے چراغ کو روشن رکھا ہے۔ اور یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

برج پریمی

۷ جولائی ۱۹۶۶ء

☆☆☆

تاثرات

خواجہ وجیہ الدین

ایم اے ایم لٹ، بی ایڈ ساہتیہ تن

لکھنو

غزل کی مقبولیت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ وہ اُردو زبان و ادب کی محبوب ترین صِنف ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی شاعروں کیلئے بھی دل کشی کا باعث بن چکی ہے۔ اور ہندی کے مقبول ترین فن کاروں نے بھی غزل کے بغیر اپنی شاعری کو نامکمل محسوس کیا ہے۔

ہندی ادب میں سب سے پہلے رنگ جی نے اردو غزل کو اپنایا اور ایک مقبول ترین گیت کار ہونے کے باوجود غزل کے رنگ میں رنگ کر ایسی شہرت حاصل کی کہ ہندی میں بھی غزل گوئی نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

غزل کی اس مقبولیت کی تمام وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے خمیر میں عشق، محبت اور اسی طرح انسان کے دلی جذبات کی حرارت موجود ہے جس کے بغیر انسان کی زندگی نامکمل ہے۔ اسی لئے ہمارے کامیاب ترین شعراء میں غزل گو شعراء کی خصوصی حیثیت ہے۔

جناب اکبر جے پوری کا شمار بھی اُن باشعور شعراء میں کیا جا سکتا ہے جنہوں

نے غزل کی اس خصوصیت کو بہ طور خاص مدنظر رکھتے ہوئے ادب کی محفل میں انسان کے دلی جذبات کی ترجمانی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اس کوشش میں وہ نہ تو ترقی پسند تحریک کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے اور نہ ہی جدیدیت کا طوفان اُن پر اثر انداز ہوسکا۔ انہوں نے جس بات کو جس طرح محسوس کیا ہے اس کو اسی طرح شاعرانہ دیانت داری کے دائرہ میں رہ کرادا کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے ان کی غزلوں میں ایک ایسا امیج ابھرتا ہے جس میں قدیم وجدید انسان کے چہرہ میں کوئی فرق تو نہیں دکھائی دیتا لیکن اس کے چہرہ کے نیچے دھڑکتے ہوئے دل کی دھڑکنیں انسانیت کی مکمل کہانی کہتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں شاعری کا مدعا بھی یہی ہے اس میں جناب اکبر جے پوری پوری طرح سے کامیاب ہیں۔

میں اُن کی شاعری کو اس لئے بھی قابلِ احترام وافتخار سمجھتا ہوں کیونکہ اس میں عامیانہ محرکات کا فقدان ہے اور وہ صداقت کے محور پر رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

جناب اکبر جے پوری صاحب بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں لیکن اُن کی رومانی شاعری می تشہیر محبت کی جگہ راز داری محبت کا پیغام ملتا ہے۔

تمہارے پیار کے قصے تمہیں کو میں سناؤں گا
تمہیں، اے بھولنے والے، میں پھروں یاد آؤں گا

اس شعر میں الفاظ کی سادگی اور اظہار کی بے ساختگی اس حقیقت کی غماز ہے کہ شاعر کو جب اپنے پیار کی لَو مدھم پڑتے ہوئے محسوس ہوتی ہے تو وہ عام

انسانوں کی طرح شکوہ وشکایت کرتے ہوئے نہیں دکھائی پڑتا بلکہ اپنے پیار کے اُجالے میں ہی اپنی محبت کے پودے کو ہرا بھرا کرنے کی کوشش پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کرتا ہے۔ اُس کی اس سعی میں کہیں پر بھی نالہ، فریاد، یا مشتہری محبت کا جذبہ کارفرما نہیں ہے۔

دراصل یہ طریقہ محبت دیوانوں کا شیوہ نہیں بلکہ اہلِ خرد کا جادہ ہے۔ بظاہر محبت اور ہوش مندی دو متضاد چیزیں ہیں لیکن اس تضاد میں اتحاد پیدا کرنا ہی اصل فن ہے۔ جس میں جناب اکبر جے پوری پوری طرح سے کامیاب ہیں اور یہ ادا اُن کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت بن گئی ہے۔

راز داری محبت کا قائل شاعر محبوب کی فرقت کا منکر نہیں۔ اس کا عقیدہ ہے ؎

آنکھوں سے تم دور مگر دل میں بسے ہو
شیشے سے حسیں عکس مٹا بھی نہ سکوں گا

ہماری رومانی شاعری کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ محبت اس درجہ تک جُڑی ہوئی ہے کہ اس کی شرح زبان تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے اور دل و دماغ سے اس کا کوئی رشتہ نہیں رہ گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سطحیت سے اُوپر اُٹھ کر ادب اور شاعری کے صاف وشفاف آئینے میں جناب اکبر جے پوری کی اس رومانی شاعری کا مطالعہ کیا جائے گا تو اس میں ہمیں انسانی اقدار کے عکس اور یونیورسل اپیل Universal Appeal کی جھلک دکھائی دے گی۔

آئینہ

(جناب حیات وارثی)

جنرل سیکریٹری آل انڈیا ہندی اردو سنگم

لکھنو:

میرے فن سے آئینے روشن ہوئے ہیں فکر کے
شمع محفل بن کے اگر، تیری محفل میں رہا

حضرت اکبر جے پوری کا یہ دعویٰ بغیر دلیل نہیں ہے۔ محفلِ اردو میں گزشتہ پانچ دہائیوں میں انہوں نے اپنے عزم و عمل اور فکر و فن سے جو چراغ روشن کئے ہیں۔ اُن سے نہ صرف جموں و کشمیر بلکہ پورا برِ صغیر روشن و تابندہ ہے۔

اکبر جے پوری نے سرینگر کشمیر میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے جو نمایاں کردار ادا کیا ہے وہ نہ صرف قابلِ تحسین بلکہ لائق تقلید بھی ہے۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ، ان کا مسلک ہے حضرت اکبر جے پوری نے اپنی عملی سرگرمیوں سے اردو کے فروغ اور اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو شعر و ادب کو عوامی مقبولیت عطا کرنے میں کم از کم کشمیر کی حد تک وہ مثالی انسان ہیں۔

حضرت شاہ ہمدان میر سید علیؒ ہمدانی سے آپ کا نسبی سلسلہ ہے والدِ گرامی آغا سید علی عاؔبد ایک عالم، فقیہ، فارسی، اور اردو کے شاعر اور کئی کتابوں کے مُصنف تھے۔

حضرت اکؔبر جے پوری کی ہمشیرہ مرحومہ سیدہ شہزادی کلثوؔم کو کشمیر کی پہلی اردو شاعرہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔

حضرت اکؔبر جے پوری کی ذات ایک منظم تحریک علمی اور بافیض ادارہ ہے۔ میں آپ کی صفات وذات دونوں کا مدّاح ہوں کسی شخصیت سے پہلی مُلاقات کا تاثُر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ میں اس مقولے کا پوری طرح قائل نہیں ہوں، لیکن چند شخصیات اس مقولے کی صداقت کی گواہی دیتی ہیں۔ میرے ذہن میں کشمیر جنت نظیر ایک خوابوں کے جزیرے کی حیثیت سے محفوظ تھا، اس کی گل پوش وادیوں کا تصور، اس کے لہلہاتے باغات کا خیال، اس کے حسین ودلفریب مناظر کو میں فکری اور تصوراتی پیکر دیا کرتا تھا۔ میری یہ دیرینہ خواہش اُس وقت پوری ہوئی جب محترم المقام سید میر قاسم سابق وزیر اعلیٰ جموں کشمیر کی دعوت میں پہلی بار کشمیر گیا۔ میرے ہمراہ شری رام کشور رستوگی اور جناب شمس فرخ آبادی بھی تھے۔

سید میر قاسم نے جو اُس وقت وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز تھے ہم لوگوں کو ریاست کا مہمان بنایا گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں قیام کا انتظام کیا اور اپنے انڈر سیکریٹری مسٹر مفتی کو ہم لوگوں کی ضیافت کا نگراں مقرر کیا۔

اس دورے میں مختلف سرکاری اور ادبی مقتدر شخصیتوں سے ملاقات ہوئی۔ سنگم کے جنرل سیکریٹری شاخ کے علاوہ اکبر صاحب نے نہایت خلوص اور اپنائیت کا مظاہرہ کیا۔ کشمیر سے واپسی پر جو چند نام ذخیرہ یاداشت میں محفوظ رہ گئے، ان میں سب سے پُرخلوص اور اہم نام حضرت اکبر جے پوری کا تھا، ان سے خط وکتابت اور مراسلت کا سلسلہ قائم رہا۔ کشمیر پھر گیا تو اکبر صاحب اس طرح ٹوٹ کر ملے جیسے برسوں بعد کسی عزیز سے ملاقات ہوئی ہو۔ وضعداری، شرافت نفسی، پیار اور ایثار حضرت اکبر جے پوری کی انفرادی خصوصیات ہیں۔ اپنائیت اور محبت کا لافانی جذبہ اُن کی سب سے بڑی کمزوری بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں خود میرا ایک شعر اکبر صاحب کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔

میں نے گرتے ہوئے لوگوں کو سنبھالا کیوں تھا

بس اِسی جُرم میں کاٹے گئے شانے میرے

اکبر صاحب کا تقریباً تمام کلام جس میں نظمیں، غزلیں، قصیدے، سلام، مرثیے، تمام اصنافِ سخن شامل ہیں، دیکھ لینے کا مجھے شرف ملا۔ ان کی شاعری، فصاحت اور بلاغت کا آئینہ ہے۔ زبان و بیان پر انہیں پوری دسترس حاصل ہے۔ علم و ادب انہیں خاندانی طور پر ورثے میں ملا ہے۔ اس لئے اُن کا کلام عہدِ گذشتہ کی روایات اور موجودہ معاشرے کی حکایات کا خوب صورت مرقع ہے۔

اکبر جے پوری صاحب ماضی، حال اور استقبال کے صاحبِ طرز شاعر ہیں۔ اُن کے فکروفن کا نگارخانہ، صدیوں کے تجربات اور سائینسی ایجادات سے

جگمگا رہا ہے۔ قرطاسِ وقت پر وہی ادیب وشاعر اپنے نقوش چھوڑ سکتا ہے جس کی گرفت کل سے کل تک ہو۔

اکبر جے پوری اُنہیں فنکاروں میں ہیں جو پیشانئ علم و ادب پر ہمیشہ جگماتے رہیں گے۔

اکبر جے پوری۔ فن اور شخصیت

رشید نازکی

اکبر جے پوری پچھلے تیس پینتیس برس سے زمزمہ سنج ہیں ان کی ولادت جے پور میں ہوئی ہے اور شعور و شعر دونوں اِسی ماحول سے حاصل کئے ہیں۔ کشمیر جنت نظیر اُن کا آبائی وطن تو ہے لیکن طبعاً وہ اس ماحول میں پرائے بھی ہیں اور غریب الدیار بھی۔ اُن کے عادات و اطوار اور اُنکی حدیث دلبری کی روائتیں سب کی سب کشمیر سے زیادہ بیرون کشمیر کی اردو آمیز فضا کی پیداوار ہیں۔ بے نیازانہ وارفتاریاں اور بے دِلانہ اندازِ زیست اکبر کی زندگی کے دو ایسے پہلو ہیں جنہوں نے اکبر کو خلوص کے نام پر ہزار بار قربان کیا اور لاکھ بار صلیب و دار کے سایوں میں کھڑا کیا۔ اگر معصوم گناہوں کی دنیائے حرص و آز میں کوئی قدر و منزلت ہے تو اکبر ایک چلتا پھرتا افسانہ اور ایک جیتا جاگتا اُرسطور ہے۔ اکبر کے ثواب وآگین گناہوں نے نہ معلوم کتنے بے نام و نمود لوگوں کی زندگیاں سنوار دیں، کتنے اُجڑے گھروں کی آبادی کا سامان کیا اور اس سعیٔ اخلاص مآب میں اکبر کی اپنی زندگی کچھ اس طرح اُجڑ گئی۔ کہ شاید اس چمن میں دوبارہ بہار آنے کا کوئی خطرہ اور خدشہ نہیں۔ اکبر گھاؤ کھاتے رہے اور جیتے رہے اور خلوص کی

نیرنگیوں کے کمین گاہوں سے اُن پر اس طرح وار ہوتے رہے کہ بار ہا اس شعر کی منہ بولتی تصویر بن گئے۔

ہوگئی غرقآب کشتی جھل گیا آخر بھرم !
موجۂ طوفان کو دستِ ناخدا سمجھا تھا میں

سرمایۂ غم ایسی اُفتادِ طبع کے انسان اور ایسی زندگی کے گنہہ گار کی سبب سے بڑی سوغات ہے۔ اس لئے اکبر کا سارا کلام غم کے زبردست سایوں اور حُزن وملال کے ابرِ مُطیر سے مالا مال ہے یہی وجہ ہے کہ اکبر کے کلام میں جدّت کے بجائے قدامت کی ایسی چھاپ ہے کہ انہیں اس دور کے شاعر کی حیثیت میں پہچاننا مشکل بن جاتا ہے۔ دراصل اکبر کی شاعری کا مطالعہ اُن کے وجود کے عقبی حالات اور اُن کے ماحول کے پس منظر میں کیا جانا چاہیے۔ اگر ایسا کیا جائے تو الفاظ اپنے معانی بدل دیں گے، تشبیہہ و استعارات قدامت کے ہزاروں پردوں سے بھی جدّتِ غم کی نِت نئی تصویروں کی نقاب کشائی کریں گے، اور ہم دیکھ پائیں گے، کہ زندگی کے محراب میں اکبر کو ہر بار دُہری کمر کے ساتھ کیوں داخل ہونا پڑا ہے۔

یہ جان کر سر اپنا ہم نے تو جھکایا ہے
بس آپکے در سے ہی چمکے گی یہ پیشانی

لیکن ابنائے روزگار کی ستم دانیوں اور طغیانی حیات تباہ کاریوں نے دوسرے ہی لمحہ شاعر کو یہ حقیقت سمجھائی ہے کہ۔

اب وصل کے وعدوں پر ہر ایک یاس برستی ہے
چھائی ہے محبت پر اِک عمر سے ویرانی!

اور وہ آخر واقعات کے اِسی منطقی نتیجے پر پہنچے کہ ۔

اُجڑا ہی گیا آخر بن بن کے چمن اپنا!
آباد کیا جتنا بڑھتی گئی ویرانی

غزل کے ان اشعار کی زبان وادا خواہ کس قدر روایاتی نظر آئے، لیکن اِن منظرو واقعات کے فسانے اور فسانوں کے واقعات اکبرؔ کی ذہنی شہادت اور دلی کرب وبلا کے اُن ہزاروں معاملات سے پردے سرکاتے ہیں جو اکبرؔ کی زندگی میں نئے نغمۂ ویرانہ اور حادثے سے واقعہ بننے کی تگ ودَو میں مصروف رہے ہیں۔ ہجر مسلسل کی ان ناکامیوں اور ناتمامیوں کے طفیل اکبرؔ کی زندگی کی شعلہ سامائیاں محرومیوں کی اوٹ میں اُبھریں، چمکیں اور بجھ گئیں۔

ہائے اکبرؔ شامِ ہجراں کی ستم آرائیاں
خود بھڑک کر گل چراغ زیر داماں ہوگیا

اکبرؔ کی غزلوں میں کہیں کہیں نہیں اکثر مجاز کے خدوخال اُبھرتے ہیں مگر قنوطیت کی ایک گہری چھاپ یہاں بھی اکبر کا دامن تھام لیتی ہے، وہ غم کے جشن منانے کے قابل نہ رہے۔ انہیں اسی کا سبب سے بڑا غم ہے کہ......۔

اکبرؔ نے اساتذہ کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور اس کا اثر اکبرؔ کے کلام پر، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، بہت زیادہ پڑا ہے۔ اس اثر نے اکبرؔ کی

زبان کو احتیاط کی چھان پھٹک کا قائل تو کیا ہے لیکن خیال کی نیرنگیوں کو اس حد تک اسیر کیا ہے کہ کہیں کہیں اُن کے کلام پر کہانت کی چھاپ ناقابلِ برداشت حد تک نظر آنے لگی ہے۔

خالِ رُخ دیکھ کے صاحب ایماں نہ رہا
کون تھا جو کہ انہیں دیکھ کے حیران نہ رہا

لیکن پھر اس کہانت کے اسی صحرا میں کہیں کہیں نظر و بصر کے قافلے ایسے چشموں پر بھی ٹھہرتے نظر آتے ہیں ۔

اُن کو آشفتہ مزاجوں کی خبر کیا ہوگی!
جن کا گیسو بھی کسی وقت پریشاں نہ رہا

یا پھر ۔

آرزو خاک ہوئی، خاک بھی دیکھی نہ گئی
دل کے اِس دشت میں شاید کوئی طوفاں نہ رہا

غم آگین فضاؤں کی تاریکیوں سے کبھی اچانک امید اور حوصلے کی بجلیاں بھی چمک اٹھتی ہیں اور اکبر پکار اُٹھتے ہیں ۔

جا رہا ہوں جلوہ گاہِ ناز میں دیوانہ وار
پھر مقدر آزمانے کی تمنا دل میں ہے

غزلوں کے اس نمناک اور شمع سامان ماحول سے نکل کر اکبر نظموں کی دنیا میں بہت آگے بڑھے ہیں۔ اکبر کا بیانیہ انداز اُن کی زیبا شناسی اور حسنِ نظر نے

کُچھ ایسے گوشے تلاش کئے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے، کہ اکبرؔ اپنے ماحول کے مطابق نظم کی دنیا میں ''بقدرِ ظرف چمک اُٹھتے ہیں ایسی نظموں میں (تجدید عہد، شہیدان وطن کی یاد میں، شاعرِ کشمیر مہجور کی یاد میں، اور دوسری نظموں کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے)۔

زندان کی شب مہتاب اکبرؔ کی ایک دلگداز اور پُر اسرار نظم ہے۔ اکبر کب کیوں اور کس طرح زندانی ہوئے۔ اس کا تذکرہ میں اُن کے سوانح نگاروں کیلئے چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن اتنا کہہ دینا ضروری جان لوں گا، کہ وہ اسیر ہوئے اور شحنۂ شہر نے ان سے وہی سلوک کیا جو حضرت غالبؔ سے ہوا تھا۔ ایسے بے درد اور بے بصر ماحول میں بڑے بڑوں کی رِدائے صبر چاک ہو جاتی ہے۔ لیکن یہاں اکبر کے آنسوؤں کے جشنِ چراغاں میں جو بات دیدنی ہے وہ اُن کی صداقت شعاری زندانِ بے گناہی اور حق و عدل کے میزانوں پر یقین محکم کی شہادت ہے۔ انہیں یقین ہے کہ بارہا بساطِ عالم پر فکر مکر و فریب کے توسل سے بے گناہوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی ہے اور ابنائے روزگار کی مہرہ بازیوں نے اپنے اعمال بد کو حُسنِ عمل کا نام دینے کے فتوے صادر کئے اور کرائے ہیں، لیکن وقت کی تلوار نے ظالموں کی چیرہ دستیوں کو کاٹ کر رکھ دیا ہے، اور بے گناہوں اور مظلوموں کی داستانوں کو دور دور تک پھیلا دیا ہے۔ ؎

مجھ سے بچھڑے ہوئے احباب کو اے ماہِ منیر
میرے اس رنج فراوان کی خبر تو ہوگی

آج شب میری طرح وہ بھی تڑپتے ہوں گے
آج شب میری طرف اُن کی نظر تو ہوگی
جانے کس حال میں ہیں میرے جگر کے ٹکڑے
اے میرے چاند، کبھی اُن کی سحر تو ہوگی

اشک وآہ کی یہ جل ترنگ فہمیدنی تو ہے، لیکن دوسرے ہی لمحہ شاعر کی رگوں کا منجمد خون سیماب بن کر تڑپنے لگتا ہے۔ ان میں توانائی اور مقاومت کے آتش فشاں پھوٹ پڑتے ہیں اور ان کے ذہن کے تمام آرکی ٹائپس، ماضی کے اساطیر اور روایات کا ایک بھرپور خزانہ انگڑائیاں لینے لگتا ہے:۔

تو نے دیکھا ہے صداقت کے علمداروں کو
حق پرستی کے سبب طوقِ وسلاسل میں اسیر
بے گناہی کے سوا کچھ بھی نہ تھا جُرم اُن کا
تھی خطا کہ وہ رکھتے تھے اِک زندہ ضمیر
کیا عجب ہے تجھے یہ دیکھ کے حیرانی ہو
حلق ہم جنس پہ انسان کی رواں ہے شمشیر

شاعر یہ کہتے ہوئے سراپا استفہام بن جاتے ہیں۔

تابکے اہلِ ستم ظلم وستم توڑیں گے
خونِ انصاف زمانے میں بہے گا کب تک؟

بے خطاؤں کیلئے دار ورسن کی تعزیر
آخر انسان یہ بیداد سہے گا کب تک؟
دور کب ہوگی تشدد کی بھیانک ظلمت
عدل کا چاند دُھندلکوں میں رہیگا کب تک؟

آخر ایمان وایقان کی فروزاں قندیلیں اس شب تاریک کی سحر کا پتہ دیتی ہیں اور شاعر کو تھپکیاں دے دے کر سمجھا رہی ہیں کہ ہر شب کا انجام سحر ہے، رات کے بانجھ پیٹ سے آخر کار صبح کاذب کا نور تولّد ہوکر ہی رہتا ہے اور اس جھٹ پٹے کے بعد تاریکیوں کے سمندر سے انوار فطرت کا شجر ایسے پھوٹنے لگا ہے کہ کائینات کا ہر ذرّہ مُستغیر ہوکر رہ جاتا ہے اور حدِ بصر خوب وزشت کو پرکھنے کا کام شروع کرتی ہے۔

خاک ہوجائے گا اِک روز یہ تیرہ ماحول
سطحِ آفاق پہ کرنوں کا شجر اُبھرے گا
ڈوب جائیں گے شب غم کے یہ بوجھل سائے
مطلعِ وقت پہ خورشید سحر اُبھرے گا
صبح کے ساتھ بدل جائے گا ہر نقش کہن
اور انسان ب اندازِ دِگر ابھرے گا

اکبر کی ایسی نظموں میں رواں دواں بیانیہ انداز اُنکے زبان اور الفاظ کی طبیعت پر بے پناہ قابو کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ وقت نہیں کہ اکبر کی دیگر نظموں کے پسِ

منظر اور عقبی ماحول کا جائزہ لیا جائے، کیونکہ اس صورت میں تعارفی مضمون تجزیاتی مطالعے میں بدل جائے گا۔ لیکن پھر بھی جنت کا شمیر، اکبر کی ایک فارسی نظم کے کچھ اشعار بلا تجزیہ پیش کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔

نخلِ طوبیٰ پست از شاخِ چنارِ کاشمیر
فرعِ سدرہ و شرمگیں از برگ و بار کاشمیر
منفعل رضواں شدہ از باغبانِ ایں چمن
بس خجل غلمان زحسنِ پردہ دار کاشمیر
طعنہ زن بر کاخِ کسریٰ خاک ایں ملکِ حسین
خندہ زن بر چرخِ خضریٰ سبزہ زارِ کاشمیر

اکبر کے کلام میں ''سلام'' اور ''نعت'' کا ایک معتدبہ حصہ ہے۔ اکبر کی اس صنف شاعری میں انکے خلوص وایقان کی شمع فروزاں ہر جگہ جلوہ گر نظر آرہی ہے۔ اکبر کے ہاں خالص اعتقاد کے گلہائے بے رنگ نہیں، بلکہ شعر و شعور دونوں کی جلوہ گری ہے۔ مثلاً کچھ شعر عرض کر رہاں ہوں۔

اے سرفروش ملّت، جاں دادۂ طریقت
اک درسِ زندگی ہے اب تک تری شہادت
اے رہبر معظم، اے قائدِ سیاست
قرآنِ حریّت ہے، تیری کتاب سیرت

ڈوبی ہوئی لہو میں تیرے عمل کی شوکت

اسلام کے چمن کی تازہ بہ تازہ نکہت

اکبر جے پوری نے باوصف اپنی حرماں نصیب حیات کے ایک بھری پُری ادبی زندگی گذاری ہے، انہوں نے کشمیر میں پہلی بار ۱۹۴۵ء میں نائٹ اورینٹل کالج کا افتتاح کیا۔ ۱۹۵۴ء سے لیکر ۱۹۶۰ء تک وہ کُل ہند انجمن ترقی اردو کی ریاستی شاخ کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے کشمیر کے دور دراز علاقوں کی اردو شناسی اور اس زبان کی ترویج کیلئے کافی جدوجہد کی۔ چھتیس ادبی جلسے منعقد کئے۔ اور ان کی کاروائیاں کتابچوں میں شائع کر کے اندرون و بیرون ریاست کے اردو داں طبقے کی توجہ اپنی جفاکشی اور محنت طلبی کے ساتھ ساتھ اس زباں کی ترویج وارتکا کی طرف بڑھی۔ اور ریاستی شاخ کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت میں آپ نے علی گڈھ، کانپور، اور دہلی کے کُل ہند اردو کانفرنسوں میں کشمیر کی نمائندگی کی۔ اور یہاں کے صحیح واقعات اور اردو کی تدریجی ترقی کی رفتار سے کانفرنس کو مطلع کیا۔ ۱۹۶۴ء سے ریاست کی راشٹریہ بھاشا پرچار سمتی کے ساتھ تال میل قائم کیا اور تقریباً آٹھ سو مسلم طلباء اور طالبات کو رضاکارانہ طور پر ہندی سکھائی۔ ۱۹۵۶ء سے ریاست میں جامعہ اردو علی گڈھ کے امتحانات کا مرکز قائم کیا اور اس ادارے کو یونیورسٹیوں سے تسلیم کرایا۔ اس طرح اردو اور ہندی دونوں زبانوں کو شانہ بشانہ طرقی کرنے اور آگے بڑھانے کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

اکبر کی صحافتی زندگی بڑی طویل ہے، چند نشانات یوں ہیں:

پنڈت پریم ناتھ بزاز ریاست کے نامور صحافی ہیں۔ ۱۹۴۸ء تک وہ کشمیر میں اپنے لاثانی اخبار ہمدرد کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت میں ہر پڑھے لکھے آدمی کے محبوب صحافی کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ہمدرد کے ان دنوں ہفتے وار ادبی ایڈیشن بھی شائع ہوا کرتے تھے اور اکبر اس ایڈیشن میں برابر کام کرتے رہے۔ یہ اخبار ۱۹۴۸ء میں بند ہوگیا۔ اور بزاز صاحب کشمیر سے دہلی چلے گئے اکبر صاحب اس کے بعد پندرہ روزہ صداقت اور آپ ہفتے وار حریت سے متعلق ہوئے اور چار سال اس کی اِدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس دوران ایک مذہبی اور ادبی جریدہ ''الارشاد'' کی نظامت کا کام بھی کرتے رہے۔ ان مسلسل تعلقوں کے علاوہ اکبر روزنامہ نیا سنسار، روزنامہ زمیندار سہ روزہ 'دیش'' اور دوسرے موقر اخباروں سے وقتی طور پر متعلق رہے۔

تصنیف و تالیف کے بازاروں میں بھی اکبر خاصے سرمایہ دار ہیں۔
میں فقط اُن کے قلم کی اعجاز کاریوں کی فہرست کا تذکرہ کروں گا۔

رہبرِ مضمون نگاری: بچوں کی خاطر ایک نہایت مفید اور معتبر گائڈ۔

رہنمائے اردو: زبان اردو کے صرف ونحو فن بلاغت اور انشا پر ایک دلآویز تصنیف۔

فن تعلیم: ''زبان اردو کی'' پر ایک مستند کتاب،

سازِ شکستہ: اکبر کی نظموں، غزلوں اور سلام، نوحوں اور نعتوں کا مجموعہ۔

رہبر ہندی: ہندی زبان کی بنیادی جان پہچان،

تراجم: اس ضمن میں یونیسکو کی طرف سے شائع شدہ سائینس تعلیمی نفسیات کی کتابوں کا اردو ترجمہ اکبر کا جہاد اکبر ہے۔ ان تمام کتابوں کو محکمہ تعلیم ریاست جموں و کشمیر نے سرکاری اداروں کی لائبیر ریوں کیلئے منظور کیا ہے۔

ترتیب و اشاعت: اخبار السادات، مورخِ کشمیر مولوی محمد شاہ مرحوم کی تاریخ کی ترتیب و تدرین، شاعرات اور اقبال: مرحومہ شہزادی کلثوم ہمشیرہ اکبر کے مقالات کی ترتیب واشاعت۔

☆ معرکہ کربلا

☆ یادگارِ کلثوم

اکبر کے سرمایۂ ادب میں ابھی کچھ آفتاب طلوع کے انتظار میں ہیں، انہیں کچھ اس طرح ترتیب کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ شمعِ سوزاں، مجموعہ کلام

۲۔ عقدِ ثُریا: ڈرامہ

۳۔ اختر تاباں: منظوم تاریخی ڈرامہ

۴۔ خون کی تحریر: ڈرامہ

۵۔ بے گناہوں کی بستی: منظوم ڈرامہ

۶۔ فکر و خیال: ادبی اور تنقیدی مضامین

اس کے علاوہ متعدد مختصر افسانے ملک بھر کے ادبی جرائد میں شائع ہو چکے

ہیں، اکبر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں Casual Artist کی حیثیت سے مسلسل کام کرتے رہے، ایک اور کام جو اکبر کے ادبی لوحِ عمل پر ہمیشہ کیلئے ثبت رہے گا، یہ ہے، اکہ انہوں نے ترقی اردو بورڈ کے ایماء پر سرکاری محکموں اور عدالتوں میں رائج بائیس ہزار قانونی اور دفتری اصطلاحات کو مع انگریزی مترادفات کے جمع کیا ہے۔

☆☆☆

اکبر ہماری محفل میں

(نور شاہ)

چندروز قبل ایک اخبار کے دفتر میں اکبر جے پوری کا ذکر چل پڑا، میرے ایک اخبار نویس دوست شجاع کشمیری نے بتایا کہ اکبر جے پوری کو اپنے قلم پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ اپنی لکھی ہوئی تحریر کی کبھی تصحیح نہیں کرتے تھے لیکن لکھنے سے پہلے بہت سوچتے تھے بلکہ اپنی سوچوں میں غرق ہو جاتے تھے۔ میرے لئے یہ نئی بات تھی حالانکہ میں ان سے بخوبی واقف تھا، ان کی عزت کرتا تھا، ان سے کبھی کبھار ملاقاتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اکبر جے پوری کا اصل وطن جے پور (راجستھان) ہے لیکن اس بات کی تردید انہوں نے یہ کہتے ہوئے کی کہ اس کے آباواجداد کشمیری نژاد ہیں اور حسن آباد سرینگر ان کا آبائی علاقہ ہے۔ دراصل ان کے والد محترم آغا سید علی آبد بسلسلہ روزگار وادی سے باہر راجستھان چلے گئے تھے اور جے پور میں عارضی طور پر سکونت اختیار کی تھی۔ اکبر علی جے پور میں ہی پیدا ہوئے اور اس طرح جے پوری ان کے نام کے ساتھ جڑ گیا، وہ اکبر علی سے اکبر جے پوری بن گئے۔ کشمیر آ کر وہ محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ریاست میں معروف اور نامور ماہر تعلیم خواجہ غلام الدین ناظم تعلیمات ہوا کرتے تھے۔ اپنی سبکدوشی تک وہ تعلیم کے شعبہ سے ہی

منسلک رہے۔

ان کے والد آغا سید علی عابد خود بھی صاحب قلم اور صاحب تصنیف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر جے پوری کا ادبی سفر تقسیم ملک سے پہلے شروع ہوا تھا لیکن کشمیر کے شعری اُفق پر وہ 1950ء میں نمودار ہوئے اور اس طرح کشمیر کے ادبی اور علمی حلقوں میں ایک اور نام کا اضافہ ہوا۔

ازل سے اکبر حزیں تجھے ملے ہیں غم ہی غم
تیرے لبوں پر کیوں ہنسی تلاش کر رہا ہوں میں

کہا جاتا ہے کہ اکبر جے پوری کے دوست بہت کم تھے اور چند ایک دوستوں نے انہیں دکھ بھی دیئے اور اس وجہ سے وہ بہت دیر تک گوشۂ گمنامی میں پڑے رہنے پر مجبور ہوئے تھے۔ خود دار اور عزت نفس کے مالک تھے ایک بے حد حساس قسم کے شاعر تھے ان کا یہ شعر اس بات کی غمازی کرتا ہے۔

جن کو دیا ہے میں نے گلستان کا بانکپن
کانٹے وہ راہ گذر میں بچھا کر چلے گئے

اکبر جے پوری دراصل غزل کے شاعر تھے اور مرحوم نچاط انصاری اس تعلق سے لکھتے ہیں:

"اکبر جے پوری کا شاعر اگرچہ ہماری وادی کے اُن روایتی غزل گو شعرا میں ہوتا ہے جو بدلتے ہوئے ادبی رجحانات اور نئی ادبی تحریکوں سے متاثر نہیں ہوتے تاہم آج کے کرب انگیز دور میں وہ ہیئتی شاعری سے کسی طرح بھی لاتعلق نہیں"۔

اکبر جے پوری اپنی ملازمت کے سلسلے میں کافی عرصہ شہر کی ہنگامہ آرائیوں اور ہنگامہ خیز رنگینیوں سے دور دیہاتی ماحول میں رہے، اس دوران ان کی شاعری میں رومان کا عُنصر شامل ہوگیا (شاید دل کسی کو دینے کے بعد)۔ دیکھئے کیا کہا ہے انہوں نے ؂

بھرپور جوش عشق میں اکبر تھا مرا دل
سمبل میں آ کے لُٹ گیا ارمان نہ پوچھئے
(سمبل علاقہ حاجن میں واقعہ ہے)

ان کا ایک اور شعر عرض کرتا ہوں ؂

لباس سرخ میں نکھرا تری بہار کا رنگ.
شفق کے سائے میں جیسے گُلاب زار کا رنگ

اکبر جے پوری نہ صرف غزل کے شاعر تھے بلکہ ان کے نعتیہ کی بھی کوئی کمی نہیں۔ انہوں نے طویل نظمیں بھی لکھی ہیں۔ انہوں نے فارسی زبان میں بھی شعر گوئی کی ہے۔ ان کو فارسی پر پوری دسترس تھی۔ اکبر جے پوری نے کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے سلسلے میں ایک معلم اور شاعر وادیب کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ مجاہد اُردو کی حیثیت سے خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے کشمیر میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی۔ انہوں نے کشمیر میں حسینی مشاعرہ اور طرحی مشاعرہ کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے صحافتی خدامات بھی انجام دیں۔

اکبر جے پوری کی ایک ہمشیرہ تھیں، شہزادی کلثوم۔ اردو کی خاتون شاعرہ کی حیثیت سے انہوں نے ریاست میں کافی شہرت حاصل کی لیکن زندگی نے ان کا

ساتھ نہ دیا اور وہ بے وقت اس دنیا سے چلی گئیں۔ ان کا اردو کلام اکبر جے پوری نے ترتیب دے کر 1963ء میں شائع کیا۔

زندگی کے آخری دنوں میں اکبر جے پوری کی صحت بگڑ گئی، وہ بیمار رہنے لگے اور آخر 4 مارچ 1998ء کو ہمیشہ کیلئے یہ دنیا چھوڑ گئے۔ ان کی شائع شدہ شعری مجموعوں میں شمع فروزاں، پیغامِ حسین، شباب وطن، سازِ شکستہ، فکر وفن اور فکر وخیال قابلِ ذکر ہیں۔

سید محمد اکبر جے پوری...... شخصیت اور کارنامے

(غلام علی گلزار)

جناب سید اکبر جے پوری کا بچپن جے پور میں گذرا۔ وہیں 23 اکتوبر 1928ء کو پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ اُس زمانے میں جے پور میں اردو زبان و ادب کا بول بالا تھا چنانچہ مہاراجہ جے پور، سالانہ اردو مشاعرہ منانے کا اہتمام بڑے تزک و احتشام کے ساتھ کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد بھی یہ سلسلہ برسوں تک برقرار رہا۔ اکبر جے پوری اُواخر 1943ء عمر میں اپنی والدہ زوجہ آغا سید علی صاحبہ کے ساتھ کشمیر آئے پھر اپنے آبائی وطن کشمیر میں ہی اپنے خاندان کے ساتھ رہائش پذیر ہوئے۔ البتہ عہدِ جوانی میں برابر سالانہ مشاعرہ میں شرکت کرنے جے پور جاتے تھے جہاں ایک دفعہ ان کے کلام سے متاثر ہو کر مہاراجہ نے اپنی شال اُتار کر سرِ محفل اکبر کے کاندھوں پر ڈال دی تھی۔

اردو زبان میں محاورات و تلمیحات سے لیس روز مرہ کی جو مٹھاس لکھنوی اندازِ بیان میں پائی جاتی تھی اس کے خدوخال سے جے پور کا ماحول بھی مالا مال تھا۔ کشمیر آکر اُن کی کشمیری گفتگو بھی اردو آمیز رہی، لیکن کشمیری اُلاصل ہونے

کے ناطے جلد ہی کشمیری زبان کو آسانی سے ورک کرلیا البتہ مدت تک لوگ سمجھتے رہے کہ اکبر جے پوری صاحب شاید تلاش روزگار میں کشمیر آکر آباد ہوئے ہیں۔

اکبر جے پوری صاحب ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے، بڑے ملنسار تھے۔ اُن کی پیشانی پر غصہ کے آثار کہیں دیکھنے میں نہیں آتے تھے اگر کبھی کبھار کسی کی ترُش کلامی کا جواب دینے کی نوبت آتی۔ اس میں خوش گفتاری اس قدر چھلکتی تھی کہ سننے والا شرمندہ ہو جاتا تھا۔ حلقہ احباب میں مزاح بہت کم کرتے تھے۔ لیکن وہاں بھی فصاحت و بلاغت کے چشمے پھوٹتے تھے۔ ان کے گفتار کا بہاؤ نہ چٹان سے ٹکرانے والی اُچھلتی کودتی موج کی طرح ہوتا تھا، نہ سُست رفتار کمزور لہر کی طرح، جس کی تھپیڑیں رُک رُک کر آتی ہوں۔ بلکہ شوق و تمنا سے موجزن رواں دواں نہر کی طرح جو مناسب مرحلوں اور وقفوں پر خوبصورت انگڑائی سے روانی کا رُخ بدلتی ہو۔ سرکاری ملازمت کے سلسلے میں جے پوری صاحب کو ایس، پی، ہائی سکول، ٹیچرس ٹریننگ انسٹی چوٹ اور اورینٹل کالج سری نگر میں بحیثیت معلم، اردو زبان وادب کے گلستان کو شاداب رکھنے کا بہت موقعہ ملا۔ آپ کی صحبت میں رہ کر اکثر طلاب کا تلفظ اور تخاطب کا لہجہ نکھر گیا۔ حتیٰ کہ بزمِ احباب و معاونین میں بھی کئی ایک نے اپنی اردو درُست کرنے کے سلسلے میں آپ سے بلواسطہ اور بلا واسطہ طبقوں کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھانے کیلئے متوجہ رہتے تھے۔ ایثار و مرّوت حاجت روائی اور دوسروں کی نصرت و معاونت سے وہ مسرور ہو جاتے تھے۔ انہوں نے متعدد طلاب کے تعلیمی

اخراجات نہ صرف پورے کئے بلکہ اُنکے طعام ولباس کے اخراجات بھی فراہم کئے۔ تعلیمی اور ادبی مصروفیات کے باوجود، اپنے علاقہ کے نادار قالین باف گھرانوں کے نونہالوں کو قرآن پاک پڑھانے کے علاوہ اُن کی مفت کوچنگ کی طرف خصوصی توجہ دیتے رہے۔ جس کے لئے صبح یا شام ضرور کچھ وقت نکال لیا کرتے تھے۔

عین دور شباب میں اکبؔر صاحب نے چند برس پریم ناتھ بزاز صاحب کی ادارت میں چلنے والے اخبار ''ہمدرد'' کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن کے انچارج کے طور پر کام کیا۔ شمیؔم صاحب اگر چہ عمر میں اُن سے چھوٹے تھے لیکن ان کے ساتھ گہری دوستی پیدا ہوگئی تھی۔ آپ نے علمی اور ادبی میدان میں شمیؔم صاحب کو اپنی رہنمایانہ شفقتوں سے نوازا پھر اُن ہی کی صدارت میں کُل ہند انجمن ترقی اردو کی شاخ کشمیر میں قائم کی، خود بحیثیت جنرل سیکریٹری کلیدی رول انجام دیتے رہے۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ صاحب کل ہند سطح پر مذکورہ انجمن کے جنرل سیکریٹری تھے۔ جس کا صدر دفتر دہلی مین تھا۔ 1958ء میں اس مقصد کیلئے دہلی میں ایک شاندار کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں کشمیر کے آٹھ نمائندوں نے شرکت کی۔ اسی انجمن کے اہتمام سے 22فروری 1959ء کو ایس پی کالج سرینگر کے آڈیٹوریم میں مولانا ابوالکلام آزادؔ کی وفات کی مناسبت سے ''یوم آزاد'' منایا گیا۔ یہ تقریب کشمیر میں اپنی ادبی نوعیت کے اعتبار سے خصوصیت کی حامل تھی جس سے اردو کی ترقی کی سمت میں نئی جہتیں اُبھر آئیں۔ چنانچہ اسی

سال کے دوران دہلی، کانپور اور علی گڈھ میں اردو کانفرنسوں کا انعقاد ہوا جن میں اکبر جے پوری صاحب کا رول خصوصیت کا حامل رہا۔

مرحوم بخشی صاحب کی وزارت کے ابتدائی برسوں میں اردو زبان کی ترقی کی جانب ریاست میں خاص توجہ مبذول کی گئی۔ میر غلام رسول نازکی صاحب، جناب کمال احمد صدیقی صاحب اور مظہر امام صاحب ریڈیو کشمیر میں اردو پروگراموں کے مسئولین تھے۔ جے پوری صاحب کو پروگرام کے بعض اجزاء کی ترتیب و تالیف کا کام سونپ دیا گیا تھا۔ جو آپ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ کلچرل اکیڈیمی اور ریڈیو کشمیر کے تعارف سے انجمن ترقی اردو کشمیر کے ذریعے، ریاستی سرکار کو، اردو زبان کی وسعت و ترقی کی جانب خصوصی توجہ دلائی گئی۔ ان کوششوں کے نتیجہ میں ریاستی لجسلیٹو اسمبلی کی منظوری کے بعد اردو زبان کو ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ کئی برس تک سرکاری اہتمام سے موسم گرما کے دوران ٹورسٹ ری سپشن ہال میں اردو مشاعروں کا انعقاد ہوتا تھا۔ مقامی اور بیرونی ریاست کے شعراء شرکت کرتے تھے۔ سیاحوں کا جم غفیر ہوتا تھا۔

کلچرل اکیڈیمی کے سیکریٹری مرزا کمال الدین صاحب کو 1959ء سے ہی جے پوری صاحب نے اردو، فارسی اور کشمیری مخطوطات کی جمع آوری تجزیاتی طبقہ ہندی اور ان کی ترتیب و تالیف کے سلسلے میں بھرپور تعاون دیا اور مشاورات فراہم کی۔ اکیڈیمی کے تعاون سے کشمیر کے متعدد مقامات پر سمینار اور مشاعرے

منعقد کئے جاتے رہے جن میں حسینیؑ مشاعرے اور طرحی مشاعرے شامل تھے۔ مقامی ادباء اور شعراء کے علاوہ بیرون ریاست کی علمی و ادبی شخصیتوں کو مدعو کیا جاتا تھا مذکورہ سرگرمیوں اور جلسوں کی کاروائی پر مشتمل کتابچے چھپوا کر تقسیم کئے جاتے رہے۔

1960ء تک مسلسل علمی و ادبی حلقوں کے ساتھ انجمن ترقی اردو کے واسطہ سے خصوصی روابطے رہے۔ آسمانِ ادب کی جن نامور ہستیوں کے ساتھ جناب اکبر جے پوری کا خصوصی رابطہ رہا اور خط و کتابت رہی ان میں چند درج ذیل مقتدر علمی شخصیتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جناب پروفیسر آل احمد سرور، جناب انور ہاشمی (مدیر ہفتہ روزہ شاہکار حیدر آباد) جناب توفیق فاروقی صاحب مدیر خاتون مشرق دہلی، پروفیسر رستوگی (گوہاٹی آسام اقبال اسٹیڈیز) جناب وارثی صدر نیشنل رائٹرس فورم لکھنو) جناب علی جواد زیدیؔ، جناب پرشاد منور لکھنوی، محترمہ بیگم آصف ضیفی۔ محترمہ بیگم صالحہ عابد حسین، جناب سرور تونسوی (مدیر شان ہند) جناب مہذب لکھنوئی، جناب پروفیسر سید محمد کمال الدین ہمدانی (علی گڈھ) جگر مراد آبادی، جناب مہر شکوہ آبادی، جناب پروفیسر شکیل رحمٰن صاحب، جناب عبدالقادر سروریؔ صاحب وغیرہ۔

اردو زبان کی وسعت و ترقی کی لگن میں جناب اکبر جے پوری ریاست میں یونیورسٹی سے لیکر اہم قصبہ جات کے پرائیمری اسکولوں تک فعال اساتذہ کی

تلاش میں رہتے تھے۔ مذاکرات، تبادلہ خیالات، نیز ابھرتے نوجوانوں، اُدباءو شعراء کی نگارشات، تخلیقات پر نقد ونظر کو واسطہ بنا کر ادب کے تخلیقی اور توضیحی دامن کو پھیلانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ اتوار کی صبح اُن کے دولت خانہ پر نو آموز قلمکاروں کا اجتماع اکثر دیکھنے میں آتا تھا۔ نثری تخلیقوں اور نظمی کاوشوں کی اصلاح کے سلسلے میں انتھک کوشش کرتے تھے۔ ریاست کی متعدد ادبی انجمنوں، علاقائی اداروں کی سطح پر ان کا رول محرکانہ وسوسیانہ ہوتا تھا یا سر پرستانہ۔ ان کی تحریک پر ''بزم ادب'' نام سے بہت سے علاقوں میں مقامی طور پر ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ کشمیر میں جن ریاستی وغیر ریاستی ادباء وشعراء کے ساتھ ان کے خاص مراسم تھے ان میں خصوصاً یہ حضرات شامل ہیں۔ جناب حسین علی تنہا انصاریؔ صاحب، جناب شمیم احمد شمیم صاحب، جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب، ڈاکٹر شکیل رحمٰن صاحب، جناب پروفیسر عبدالقادر سروریؔ صاحب، محترمہ بلقیس فاطمہ صاحبہ، جناب تیج بہادر بھان صاحب، جناب اسرارالحق مجازؔ صاحب، جناب نندلالؔ صاحب، جناب غلام رسول سنتوشؔ صاحب، جناب فِدا محمد حسنین صاحبؔ، جناب پروفیسر آراین شاستری صاحب، جناب ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب، جناب پروفیسر رحمٰن راہیؔ صاحب، جناب مرزا عارف بیگؔ صاحب، جناب پروفیسر محی الدین حاجنی صاحبؔ، جناب رشید نازکیؔ صاحب، جناب پروفیسر مرغوب بانہالیؔ صاحب، جناب غلام رسول نازکیؔ صاحب، جناب قیصر قلندر صاحبؔ، جناب خادمؔ صاحب (پرنسپل اسلامیہ سکول سرینگر) اور جناب

فاضل کشمیری صاحب وغیرہ وغیرہ۔

1965ء تک مختلف سماجی و سیاسی وجوہ کی بنا پر مذکورہ سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ لیکن 66ء سے 1985ء تک مختلف زاویوں سے آپ نے کمر ہمت باندھ کر علمی و ادبی خدمات کو پھر سے جاری وساری رکھا۔ بلواسطہ یا بلاواسطہ طریقے پر آپ نے متعدد اخباروں، جریدوں اور ادبی اداروں کی نشریات کیلئے بھی کئی کئی برسوں تک کام کیا۔ یہاں چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔ 1954ء سے 1960ء تک اخبار ''حریت'' کیلئے مذہبی جریدہ ''الارشاد'' کیلئے پندرہ روزہ 'صداقت'' کیلئے۔ چند برس 1977ء تک ماہنامہ ''نصرۃُ الاسلام'' کیلئے۔ چنانچہ اخبار'' آئینہ'' کو ابتدائی چند برس کے دوران ایک خاص نہج دینے میں آپ کا اہم حصہ رہا۔

مذکورہ جرائد کے علاوہ متعدد اخبارات، مجلّات میں اکبر جے پوری کے مضامین اور ادبی شاہکار چھپتے رہتے تھے۔ نیز اُن کی ادبی تخلیقات یا اُن کی سرگرمیوں پر تبصرے چھپتے تھے۔ جیسے ''نیا دو، آج کل، شیرازہ، شانِ ہند، خاتون مشرق، گلابی کرن، کشمیر یونیورسٹی کا خصوصی رسالہ بازیافت) شاہکار، چھاؤں، بانو، کلیاں، قومی راج (حکومت مہارشٹر کا اردو رسالہ)، عقیدت، سفینہ، الارشاد، ''

ان کے علاوہ روزنامے: ''خدمت، ہمدرد، نیا سنسار، زمیندار، عقاب، سری نگر ٹائمز'' وغیرہ۔

1956ء میں سید اکبر جے پوری صاحب نے کشمیر میں جامعہ اردو علی گڈھ کے امتحانات کا مرکز قائم کر کے متعلقہ امتحانات کو یونیورسٹی سے تسلیم کرایا۔ اس طریقہ کار سے سینکڑوں جوانوں کو تعلیمی میدان میں (پارٹ ٹائم) حصول کے ذریعے آگے بڑھنے کا موقعہ ملا۔ اس طرح اردو اور انگریزی زبان میں مخصوص امتحانات پاس کر کے گریجویشن تک پہنچنے کا وسیلہ آسان ہو گیا اور ایم اے اور پی ایچ ڈی کے دروازے ان کیلئے کھل گئے۔

ریاست میں آل انڈیا ہندی اردو سنگم جموں و کشمیر برانچ نے 1980ء تک بہت کام کیا۔ فورم کے ریاستی صدر جگن ناتھ آزاد تھے اور اکبر جے پوری اس کے نائب صدر تھے۔ اس فورم کے ذریعے اردو حلقوں کو ہندی سیکھنے اور ہندی حلقوں کو اردو سیکھنے کی سمت میں کچھ کام ہوا۔ لیکن شاید سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اس کے پیش نظر منصوبے التوا میں پڑ گئے۔

کشمیر میں ''مجلس النساء'' کے قیام کے سلسلے میں آپ نے محرکانہ رول ادا کیا۔ خواتین کی اس تنظیم نے 1981ء میں محترمہ عتیقہ بانو صاحبہ سوپور اور محترمہ شملہ مفتی صاحبہ (پرنسپل وومن کالج سرینگر) کی کوششوں سے وادی کے کئی اضلاع میں اہم مقامات پر کئی جلسے منعقد کئے۔ جن میں خواتین نے حصہ لیا۔ اکبر جے پوری کی کوشش سے سرینگر میں ''خاتون'' نام کے ادبی مجلد کی شروعات ہوئی تھی البتہ اس کی اشاعت چند شماروں کے بعد جاری نہ رہ سکی۔

جناب اکبر جے پوری صاحب اردو، انگریزی، فارسی، ہندی اور عربی،

زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ البتہ اردوزبان وادب کے ماہر کی حیثیت سے یونیورسٹی اور بورڈ آف سکول ایجوکیشن نے آپ سے کئی بار تبادلہ نظر اور رائے زنی کے ذریعے صلاح ومشورہ کیا اور بعض اوقات اعلیٰ امتحانات کی نگرانی کے سلسلے میں آپ سے خدمات حاصل کی گئیں۔ پی ایچ ڈی کے کئی ریاستی و غیر ریاستی طلاب کو آپ سے تحقیق کے سلسلے میں گائیڈنس نصیب ہوئی۔ ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے آپ کی متعدد تخلیقات نشر ہوتی رہیں۔ نعت اور نوحے اس قدر عام ہوئے کہ بعض (عام افراد) کے بارے میں مشہور ہوا کہ انہوں نے اکبر جے پوری کے کلام کو اپنے نام سے منسوب کیا ہے۔

1973ء سے 1984ء تک ہندوستان کے تین مشہور اداروں ۱۔ ساہتیہ اکادمی ۲۔ Rifa Cimen to organisation اور Famous India Publications دہلی نے اپنے Who is who جرنلوں Preference India وغیرہ کیلئے اکبر جے پوری صاحب کو فعال شخصیات کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔

مطبوعات تصانیف اردو:

سازشکستہ، پیغام حسینؑ، رہبر مضمون نگاری، رہنمائے اردو، رہنمائے ہندی، فکروفن، فکروخیال، چمن زار (یہ مجموعہ کلام 1998ء میں شائع ہوا)، شگوفے، یہ کتاب 1999ء میں شائع ہوئی۔ جس میں اکبر جے پوری صاحب نے بچوں کی نفسیات سے ہم آہنگ دلچسپ

مضامین کو منظوم روپ دیا ہے۔ جناب اکبر جے پوری صاحب کا انتقال 4 مارچ 1998ء کو ہوا۔

بعض غیر مطبوعہ تصانیف:

بکھرے موتی، تبرکات، ملاپ، ایک ڈرامہ ہے اور کئی ڈارمے جو منتشر حالت میں ہیں، زادِراہ، شعار خیال، ذکر کربلا (نوحہ جات) بعض مطبوعات کی جزوی تالیف و ترتیب اکبر جے پوری کی سعی و توجہ شامل رہ چکی ہے۔ جیسے یادگار کلثوم، معرکۂ کربلا، اقبال اور شاعرات، شمع حرم (شاعرات اردو کے کلام کا منتخب مجموعہ) اخبارِ سادات، ....گلدستہ)۔

تحری خصوصیات اور کلام کے چند نمونے: شہرہ آفاق ادیب اکبر جے پوری شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ ادبیات کے علاوہ انہوں نے سیاسیات پر بھی قلم اٹھایا اور سماجیات پر بھی۔ وہ جو لکھتے تھے اس کے ذریعے وہ کچھ پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کی تحریر میں انسانی قدروں کے احیاء اور اصلاح معاشرہ کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا۔ زبان شستہ اور محاورہ ہوتی تھی۔ ان کے بہت سے مضامین دینی جرائد میں بھی چھپ چکے ہیں اور اخباروں میں بھی۔ مراحلِ تحریر سے، موضوع کی روشنی میں۔ محف ناظرین کے مجموعی مزاج و ذوق کا احساس چھلکتا ہے۔

خط و کتابت انہوں نے بہت کی ہے احباب و اقارب کے درمیان بھی۔ تنظیمی دائرہ کار میں بھی۔ بزرگ ہو یا خورد، تخاطب میں آداب و احترام کی فراوانی نظر آتی ہے۔ انتظامی امور کو احاطہ تحریر میں لاتے وقت عبارت مختصر ہوتی

ہے۔

ان کے نظمی اور نثری شاہکار خود ان کی زندگی کے نشیب و فراز کا پتہ دیتے ہیں۔ سماجی اور سیاسی حالات سے براہِ راست متاثر ہونے کے باوجود وہ خوف زدہ نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ عزم وارادہ کو جوان رکھا۔ ان کی شاعری مجموعاً قدامت وجدّت کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ اس سے اُن کی شخصیت کے متعدد پہلو روشن ہوجاتے ہیں اور ان کے کردار کی عمودی عکاسی ہوتی ہے۔

بچوں کیلئے انہوں نے عام فہم زبان بہت لکھا ہے۔ جس کا ایک اندازہ اس ضمن میں منتخب نظموں پر مشتمل کتاب ''شگوفے'' سے ہوتا ہے۔ بحیثیت اُستاد وہ بڑی مدت تک بچوں کی نفسیات کا مطالعہ کرتے رہے۔ ان کے حرکات وسکنات کا گہرا مشاہدہ کرکے سکوتِ لالہ گُل سے ہمکلام ہونے کی کوشش بھی انہوں نے کی۔ بچوں کی بحروں میں انہوں نے بچوں کی دلچسپی کے مضامین اس طرح نظم کئے ہیں کہ بچے ان کو زبانی یاد کرنے میں خوشی محسوس کریں۔ ان نظموں میں نفسیاتی مراحل کے بنیادی عوامل کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ مفرداتِ نفس، احساسِ توجہ، تمیز، تشابہ، کی مشق کیلئے نسخہ کیمیا بھی میسر ہوتا ہے۔

اکبر جے پوری صاحب چمن ہستی میں پھولوں کی شگفتگی اور کونپلوں کی اُچک کو نونہالانِ چمن کیلئے، آفاقیت کے پیغام کا ذوق وجذبہ بیدار کرنے کے حوصلہ سے ہم آہنگ کرتے ہیں:

چنار کے موضوع پر چند اشعار

کشمیر کی عزت کا نشان ہوں
صدیوں سے کھڑا ہوں میں جہاں ہوں
گرمی میں ہے ٹھنڈا میرا سایہ
قدرت نے مجھے ایسا بنایا
اُلفت ہے، محبت مرا پیغام
ہر حال میں خدمت ہے مرا کام

بادام واری کے موضوع پر چند اشعار

یہاں مسجدوں کی اذاں ہے
مرے سر پہ اِک آستاں ہے
خدا کی یہ رحمت ہے ساری
مرا نام بادام واری
ہے منظر یہ مندر کا پیارا
مرے ساتھ ہے گور دوارہ
مرا فیض سب پر ہت واری
مرا نام بادام واری

جھیل ڈل کے موضوع پر چند منتخب اشعار ؎

کنول کے کھِلے پھول آئی بہار
میں ڈل جھیل ہوں میرا دیکھو نکھار
ہے جو صاف آئینہ پانی مرا
نہیں ساری دنیا میں ثانی مرا

چند منتخب مزاحیہ اشعار جن میں دلچسپی میں گھول کر احساس ذمہ داری کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں: ؎

جب سے وہ اپنے میٹ ہوئے ہیں
ہم تو اکثر لیٹ ہوئے ہیں
بولتے ہیں اب خواب میں ڈیڈی
جب سے ایڈوکیٹ ہوئے ہیں

ایک اور نظم کے چند اشعار ؎

فائنل میچ ہوتا ہے جس دن
کھانا پینا حرام ہوتا ہے
رائٹنگ میری اتنی اچھی ہے
نون بھی بڑھ کے لام ہوتا ہے
سر اٹھانا بھی کیا ضروری ہے
سر ہلا کر سلام ہوتا ہے

ایک بہاریہ نظم کے چند اشعار۔

وہ دیکھو چمن میں ہے آئی بہار	کھلے بیل بوٹے ہرے ہیں چنار
جدھر دیکھتے ہیں ہری گھاس ہے	گُلابوں کی پھیلی ہوئی باس ہے
بسوں میں ہے ہلچل مچی آج کل	سکولوں میں رونق ہوئی آج کل

☆

اکبر جے پوری صاحب زندگی کے متعلق جن مراحل سے گذرے ہیں کہے گئے اشعار میں وہ جھلکیاں ملتی ہیں۔ اپنے حریفوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

خمار زندگی کو ہم خیالِ خام سمجھے ہیں
صدائے دِل کو آواز مشکتِ جام سمجھے ہیں
زبان سے کیا کہیں اُن تنگ ذہنوں کو ہم اے اکبر
ہمیں بدنام کرنے میں جو اپنا نام سمجھے ہیں

اسی نظریۂ کے حوالہ سے ذوقِ تغزل اور شعری نزاکت کا ایک نمونہ۔

تیرے مقابل آیا تو حیران ہوگیا	آئینہ اپنی ضِد پہ پشیمان ہوگیا
جب کائنات سمٹی تو درے میں ڈھل گئی	قطرہ بڑھا تو نوحؑ کا طوفان ہوگیا

☆

اکبر جے پوری صاحب کو اپنے وطن کشمیر سے بہت محبت تھی۔ ''ساز شکستہ'' کے حصہ نظم میں شبابِ وطن کے عنوان کے تحت، مکان اور مکینوں کے محاسن کو رقم

کیا ہے۔ ایک شعر۔

شیخ اور برہمن کو بغلگیر دیکھئے

اس آئینہ میں صورتِ کشمیر دیکھئے

☆

فارسی زبان میں بہت کم لکھا ہے لیکن فارسی جیسی ترین زبان میں وطن عزیز کی شگفتگی کا بیان نہ کرتے یہ کیسے ممکن تھا نمونہ کے طور پر۔

حضرت اقبالؔ دارد نسبتی با خاکِ پاک

ہست زین العابدین ہم نامدارِ کاشمیر

مومنؔ و سرشارؔ بودہ از مشاہیرِ وطن

للہؔ و حبہؔ ہم اندازِ افتخارِ کاشمیر

☆

''زندان کی شبِ مہتاب'' اکبرؔ صاحب کی ایک دِل سوز نظم ہے۔ زمانے کی چیرہ دستیوں کو دیکھ کر وہ نوائے دل سناتے ہیں۔ حاسدوں کے فکرو زیب کا مشاہدہ کر کے ان کا حوصلہ ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ لیکن فوراً ہی سنبھل کر کمر ہمت باندھ لیتے ہیں اور صداقت کے علمبرداروں کی یاد ے ان کے ایمان وایقان کو جِلا ملتی ہے۔ وہ اُس دن کا خوشی سے انتظار کرتے ہیں جب تشدد کے اندھیرے کو عدل کی روشنی دور کر دے گی۔ چند منتخب اشعار۔

مجھ سے بچھڑے ہوئے احباب کو اے ماہِ مُنیر
میرے اس رنج و فراواں کی خبر تو ہوگی
آج شب میری طرح وہ بھی تڑپتے ہوں گے
آج شب میری طرف اُن کی نظر تو ہوگی
جانے کس حال میں ہیں میرے جگر کے ٹکڑے
اے میرے چاند! کبھی ان کی سحر تو ہوگی

☆

پھر اگلے بند میں ۔

تو نے دیکھا ہے صداقت کے علم داروں کو
حق پرستی کے سبب طوق و سلاسل میں اسیر
بے گناہی کے سوا کچھ بھی نہ تھا جُرم ان کا
تھی خطا اتنی کہ وہ رکھتے تھے ان زندہ ضمیر

☆

پھر اگلا بند۔

بے خطاؤں کیلئے دار و رسن کی تعزیر
آخر انسان یہ بیداد سہے گا کب تک؟
دور کب ہوگی تشدد کی بھیانک ظلمت
عدل کا چاند دُھندلکوں میں رہے گا کب تک؟

☆

سسرال میں قدم رکھنے والی بہو کو اپنے اشعار سے سجایا ہوا تحفہ یوں پیش

کرتے ہیں ۔

دلکشی لاؤ میری بیٹی میرے گلشن میں
ہر خوشی پوری طرح کھلے میرے آنگن میں

یہ میری تم کو نصیحت ہے صدا یاد رہے
زندگی بھر تمہیں مفہوم وفا یاد رہے

جب مشکلیں آئیں تو تسلیم و رضا یاد رہے
کچھ ملے یا نہ ملے شکرِ خدا یاد رہے

☆

زندگی میں اُن کی آخری نظم کا ایک شعر جو مارچ 1998ء انتقال کے بعد بروزِ جمعہ چہارم کی مجلس میں پیش کی گئی ۔

اب قبر میں شاید مجھے آرام ملے گا
دُکھ درد زمانے کا ہمیشہ ہی سہا ہے!

غلام علی گلزار

۱۷ جون 2011ء

اکبر جے پوری:

شخصیت اور شاعری

(آمد ۲۳/اکتوبر ۱۹۲۸ء۔ رخصت ۴/مارچ ۱۹۹۸ء)

ڈاکٹر شاہد سلیمان شعبہ اردو فارسی یونیورسٹی آف راجستھان جے پور

میرے فن سے آئینے روشن ہوئے ہیں فکر کے
شمعِ محفل بن کے اکبر تیری محفل میں رہا

وادی کشمیر کے کہنہ مشق شاعر اور ادیب سید محمد اکبر جے پوری کا شمار آزادیِ وطن کے دوران شعری اُفق پر اُبھرنے والے شاعروں میں ہوتا ہے۔ انہیں غزل اور نظم دونوں اصناف پر قدرت حاصل تھی، ان کے سات شعری مجموعے "شمعِ فروزاں" (۱۹۵۴ء)، "شبابِ وطن" (۱۹۶۰ء)، "سازِ شکستہ" (۱۹۶۱ء)، "فکرو خیال" (۱۹۸۷ء) "فکروفن" (۱۹۹۳ء) "چمن زار" (۱۹۹۸ء) اور "شگوفے" (۱۹۹۹ء) وغیرہ ہم شائع ہوکر ادبی دنیا میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض شعری ونثری تصانیف غیر مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔

سید اکبر جے پوری کشمیری النسل تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب شاہِ ہمدانؒ امیر کبیر میر حضرت شاہ ہمدانؒ صاحب جید عالم، مبلغِ دین، شاعر اور صاحبِ تصانیفِ کثیرہ تھے۔ ان کے اخلاف میں بھی علم وادب کی روایت قائم رہی۔ چنانچہ میر سید زماں آج سے ایک صدی پہلے محلّہ حسن آباد سرینگر میں مقیم تھے، بہت بڑے

عالم اور شہر کے معزز ترین اصحاب میں شمار کئے جاتے تھے، مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دربار میں اُن کی عزت تھی اور مہاراجہ نے ان کو اعزازی جاگیر بھی عطا فرمائی تھی۔

اکبر جے پوری کے والد ماجد آغا سید علی، سید تقی شاہ کے بیٹے اور میر سید زماں کے پوتے تھے۔ علومِ عربی و فارسی میں فارغ التحصیل تھے۔ آغا سید علی عابد عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ادبی وشعری ذوق بھی رکھتے تھے، وہ اُردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی شعر کہتے تھے، ان کا بیشتر شعری سرمایہ ۱۹۴۷ء کے فسادات اور خود ان کے قتل کے سانحے کے سبب تلف ہو گیا۔ بقیہ کلام اکبر صاحب نے ''تبرکات'' کے نام سے ترتیب دیا ہے جو اشاعت کا منتظر ہے۔ آغا سید علی عابد کو اپنے اسلاف سے دین و دانش کی دولت وراثت میں ملی تھی، وہ مذہبی اور سماجی سطح پر روشن خیالی اور وسیع النظری کے قائل تھے۔ منطقی اور سلجھا ہوا ذہن رکھتے تھے، لہٰذا کسی طرح کی مسلکی تنگ نظری اور کٹھ ملائیت کے خلاف تھے، مگر افسوس کہ انہیں قدروں کی پاسداری کی پاداش میں انہیں ترکِ وطن کے سانحے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ غالباً 1915ء کا واقعہ ہے کہ کشمیر کے شیعہ مسلک کے ایک عالمِ دین نے مسلکی و مذہبی معاملات و مسائل پر کوئی کتاب تصنیف کی تھی، آغا سید علی عابد نے (جو اس وقت کسی مذہبی عہدے پر فائز نہیں تھے) جب اس کتاب کا مطالعہ کیا تو انہیں مصنف سے بعض معاملات میں اختلاف پیدا ہوا اور انہوں نے مذکورہ کتاب پر اصلاحاً حاشیے تحریر کر دیئے۔ یہ بات جب فاضل

مصنف تک پہنچی تو اس معاملے نے گمبھیر روپ اختیار کرلیا۔ فاضل مصنف کے ہمنواہوں اور مریدین نے سید علی عابد کے خلاف محاذ آرائی شروع کردی، اولاً سماجی و مسلکی سطح پر ان کا بائیکاٹ کیا گیا، بعد میں اس مسئلے نے اتنا طول پکڑا کہ سید علی عابد کو ان کے ہم مسلک مخالفین و معترضین نے کشمیر چھوڑنے پر مجبور کردیا۔

سید علی عابد اپنے برادرِ اصغر سید محمد کے ہمراہ ۱۹۱۴ء کے آس پاس پہلے یوپی (نینی تال) اور بعد میں جے پور سکونت پذیر ہوئے۔ دونوں بھائی مشترکہ طور پر بڑے پیمانے پر ملک بھر میں بلڈنگ کنسٹرکشن کا کام کرتے تھے۔ جے پور کے مہاراجہ مادھوسنگھ جی نے سید علی عابد کی عزت افزائی کی اور اپنے دربار میں انہیں مذہبی معاملات کے کسی عہدے پر مامور کیا۔ سید محمد نے ۱۹۲۸ء کو نینی تال میں ہی وفات پائی۔ سید علی عابد اپنے کاروبار کے سلسلے میں ۱۹۴۵ء کو گولیار (ایم پی) گئے، وہاں وہ سرکاری اعزاز کے ساتھ مقیم تھے کہ آزادیِ وطن کے دوران پیدا شدہ فرقہ وارانہ فسادات میں انہیں وہیں قتل کردیا گیا۔

اکبر جے پوری سید علی عابد کی دوسری بیوی (جو اُن کی چچازاد بہن بھی تھیں) سے ۲۳؍اکتوبر ۱۹۲۸ء کو بمقامِ جے پور پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے والد ماجد عابد صاحب سے حاصل کی۔ مسلم مڈل اسکول (جو اس زمانے میں جے پور کا مشہور اسکول تھا) سے مڈل بورڈ اول پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے بعد دربار ہائی اسکول جے پور سے میٹرک کا امتحان بھی امتیازی نمبرات کے

ساتھ پاس کیا۔ یہاں وہ ادبی وشعری محفلوں میں بھی حصہ لینے لگے تھے۔ اس دوران اکبر صاحب کو دربار ہائی اسکول میگزین کی ادارت کا کام خوش اسلوبی سے انجام دینے کے سبب ایک میڈل بطورِ انعام دیا گیا۔ بعدازاں مہاراجہ کالج جے پور (جس کا شمار ملک کی بڑی دانشگاہوں میں ہوتا تھا) میں بھی کالج میگزین کی ادارت اکبر جے پوری نے سنبھالی۔ ابھی اکبر بی۔اے۔ فائنل میں زیرِ تعلیم تھے کہ آزادیِ وطن کے دوران ملک بھر میں فسادات شروع ہو گئے۔ ان کے والد علی عابد کو گولیار میں شرپسندوں نے شہید کر دیا تھا، چنانچہ نامساعد حالات کے پیشِ نظر اکبر جے پوری ۱۹۴۶ء کے آخر میں اپنی والدہ اور چھوٹے بہن بھائیوں کو ساتھ لے کر اپنے آبائی وطن سرینگر کشمیر منتقل ہو گئے۔

کشمیر آ کر اکبر صاحب کو از سرِ نو بی اے کا امتحان دینا پڑا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ادیب، فاضل (امتیازی نمبروں کیساتھ) اور منشی فاضل کی سند بھی حاصل کی۔ اپنی زندگی میں انہوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ وہاں پر مختلف درسگاہوں میں تعلیمی خدمات انجام دیتے ہوئے آخر میں گورنمنٹ اورینٹل کالج سرینگر کے پرنسپل کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ عمر کے آخری دہے میں صاحبِ فراش رہے اور معمولی علالت کے بعد ۱۴ر مارچ ۱۹۹۸ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

خالی ہو جائے گی اب اہلِ ادب سے دنیا
ایک اک کر کے سبھی اہلِ سخن جاتے ہیں

(اکبر جے پوری)

اکبر جے پوری نے کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے سلسلے میں ایک معلم اور شاعر وادیب کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ مجاہد اردو کی حیثیت سے علمی وادبی خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے اپنے دور میں اردو کے سلسلے میں جو کام کئے وہ قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہیں۔ اکبر جے پوری نے اپنی کوششوں سے ۱۹۵۴ء کو کشمیر میں ''انجمن ترقی اردو'' کی ریاستی شاخ قائم کی اور ۱۹۶۰ء تک اس کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے جگرداری کے ساتھ فروغِ اردو کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اردو زبان کو عوام الناس میں مقبول کرنے اور روزگار سے وابستہ کرنے میں بھی انہوں نے قابلِ ستائش کام کیا ہے۔ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے جامعہ اردو علی گڈھ کا مرکز سرینگر میں قائم کیا اور کشمیر یونیورسٹی سے اس کی حیثیت تسلیم کروائی جس سے متعدد طلباء کو فیض پہنچا ہے۔ ۱۹۵۹ء کو اکبر صاحب نے ''حسینی مشاعرہ'' اور بعد میں ''طرحی مشاعرہ'' کی بنیاد رکھی۔ یہ روایت عرصے تک قائم رہی۔ اسی طرح ''آل انڈیا اردو ہندی سنگم'' کی جموں کشمیر شاخ کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے انہوں نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادبی حلقوں کو قریب لانے اور لسانی تعصب کے جراثیم کو ختم کرنے کی سعی مشکور کی ہے، اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں اکبر صاحب نے بعض رسائل و جرائد مثلاً صداقت، حریت، الارشاد اور نصرۃ الاسلام سے وابستہ رہ کر صحافتی خدمات بھی انجام دیں۔ علاوہ ازیں کشمیر میں عوامی سطح پر اور نو واردانِ بساطِ ادب میں شعری ذوق پیدا کرنے اور ان کی ذہنی تربیت میں بھی اکبر جے پوری کی مساعی بارآور

ہوئیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بقولِ خود اُن کے چالیس سے زیادہ عظیم مشاعرے منعقد کرائے۔ چنانچہ اکبرؔ صاحب کی اردو دوستی اور فرض شناسی کے سلسلے میں سرور تونسوی نے لکھا ہے:

"اردو کو عوام میں مقبول بنانے اور اردو کے چلن کو بڑھاوا دینے اور اردو زبان کی تعلیم کے متعلق حکومت سے مطالبے منوانے میں اکبرؔ کا بڑا ہاتھ ہے۔ انجمن ترقی اردو کے تحت حال میں چار پانچ بڑے عظیم الشان جلسے اور مشاعروں کا اہتمام ہوتا رہا ہے۔ یومِ اقبالؔ، یومِ غالبؔ، طرحی اور موضوعی مشاعرے بڑی دھوم سے منعقد کئے جاتے ہیں اور اکبرؔ اپنے گاڑھے پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو ایسی ادبی تقریبوں میں خوشی سے نثار کرتے آئے ہیں۔ [۲]

غرض کہ اکبرؔ صاحب نے وادیِ کشمیر میں اردو کے فروغ کیلئے تن، من اور دھن سے بے لوث خدمات انجام دیں۔ اردو کے تئیں ان کی محبت اور لگن دیوانگی کی حد تک بڑھی ہوئی تھی، اگرچہ ادبی حلقے میں ان کا ساتھ دینے والے کم ہی لوگ تھے، لیکن ان کے دل میں اردو کے تئیں جو جذبۂ ایثار تھا، وہ انہیں اپنے ہر ارادے اور ہر آزمائش میں کامیاب رکھتا تھا، اکبرؔ صاحب کے حسنِ اخلاق اور ادب دوستی و اردو نوازی کے متعلق ڈاکٹر برج پریمی صاحب نے درست لکھا ہے:

"......اکبرؔ سے یہی ملاقات کچھ مدت کے بعد دوستی میں بدل گئی۔ میں نے ان کو مختلف منزلوں پر مختلف چہروں میں دیکھا اور میرا یہ خیال یقین میں بدل گیا کہ اکبرؔ خلوص اور دوستی کا زندہ اجاوید پیکر ہے...... بہت سال بعد جب اکبرؔ اور

میں چند اور دوستوں کے ساتھ ماہنامہ ''دیش'' کے ادارۂ تحریر کے ساتھ کچھ عرصے کیلئے وابستہ ہو گئے تو نہ صرف یہ کہ میں ان کی محبت کا قائل ہو گیا بلکہ ان کی جگر کاوی اور دوستی سے بھی بے حد مرعوب ہوا، اور میں نے محسوس کیا کہ یہ شخص اردو کی محبت کیلئے اپنی جان بھی دے سکتا ہے...... اکبر ایک عجیب اور پُر اسرار شخصیت ہے، اسی زمانے میں وہ بذاتِ خود ایک ادارہ تھے ''انجمن ترقی اردو'' کی مقامی شاخ کے سیکریٹری کی حیثیت سے انہوں نے قابلِ قدر کام کیا۔ حالانکہ ان کے ساتھ تعاون کرنے والے گنتی کے چند افراد ہی تھے۔ بعض معترضین کہا کرتے تھے کہ یہ صرف ''وَن میں شو'' ہے لیکن اس ایک آدمی نے کتنے عظیم الشان مشاعرے اور مناظرے منعقد کرائے اور ان تقریبوں میں جو سلیقہ اور رکھ رکھاؤ ہوا کرتا تھا، وہ صرف اکبر جے پوری جیسا آدمی ہی کر سکتا تھا۔ کسی کے آگے دستِ سوال پھیلانا اس کی غیرت وحمیت نے کبھی گوارا نہ کیا، نہ ہی حکومت یا کسی ادارے سے مالی معاونت ملتی تھی، پھر بھی اتنی محفلوں اور کئی کُل ہند مشاعروں کا اہتمام کرنا ان کے خلوص وایثار کا ہی کرشمہ تھا''۔ ۳۴

جے پور سے کشمیر سکونت اختیار کرنے کے بعد اکبر جے پوری اپنی اردو دوستی اور ادبی صلاحیتوں کی وجہ سے کشمیر کی معزز اور معتبر ادبی شخصیتوں میں شمار کئے جانے لگے تھے، ان کی ادبی کاوشوں اور شاعرانہ صلاحیتوں سے بعض کوتاہ نظر حضرات پریشان بھی تھے۔ ادبی چشمکیں اور قابتیں ہر دور اور ہر علاقے میں دیکھنے میں آئی ہیں۔ کشمیر میں اکبر جے پوری کو فروتر کرنے میں ہر ممکن کوشش کی۔

بعض حاسدوں نے شخصیت کشی کا وہ رنگ بھی دکھا دیا کہ اس رونقِ محفل کو قیدیٔ زنداں بنا کر ہی دم لیا۔ اکبر جے پوری کے بدخواہ انہیں مجرم ثابت کرانے اور صحنِ زنداں تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔ اکبر صاحب نے اپنی زندگی کے تقریباً نو ماہ صحنِ زندان میں نغمہ سنجی کرتے ہوئے گزارے اور پندرہ سال کی عدالتی کاروائی کے بعد آخر کار انہیں باعزت بری کیا گیا ۔

نغمہ سنجی سے آپ کی اکبر
یہ قفس گلستان نہ ہوجائے

اپنی زندگی کے اُن پندرہ سالوں میں اکبر جے پوری ملازمت سے باہر رہے، چنانچہ کثیر الاولاد ہونے کے سبب اس دوران انہیں اقتصادی مسائل سے دوچار ہونا پڑا، اکبر کی زندگی اور شاعری پر اس واقعہ کے براہِ راست اثرات مرتب ہوئے۔ یاران وطن کی کھلی منافقت سے اکبر کا دل چھلنی ہوکر رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس حادثے نے انہیں گوشہ نشینی اور تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ کرب انگیز حالات کے علاوہ اکبر جے پوری کو ان مسائل و مراحل سے بھی دوچار ہونا پڑا جن کا ذکر مرحوم منظر سلیم نے اپنی ایک نظم ''لکھنو کیوں یاد آتا ہے مجھے'' میں کیا ہے۔ نظم کے چند مصرعے حسبِ ذیل ہیں۔

لکھنو جینا جہاں دشوار تھا
نوکری کی شاعری کی، ناولیں لکھتا رہا
اور بہت کچھ وہ

چھپا جو دوسروں کے نام سے
پھر بھی ہونٹوں سے مرے لپٹا رہا
دال روٹی کا سوال ؎۴

اکبر جے پوری کا شعری سفر نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ اس ضمن میں خود ان کا بیان ہے۔

"...... حالانکہ ۱۹۴۵ء سے آج تک وطنِ عزیز کی بدلتی ہوئی حالتوں کی بہت سی حسین و دلکش تصویریں اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کھینچی ہیں اور اس دورِ انقلاب کی تقریباً تمام خونیں داستانوں کو دامانِ شاعری پر سجایا ہے لیکن ابھی ان کا منظر عام پر لانا خلافِ مصلحت ہے"۔ ؎۵

تخلیقی عمل سے عرصہ طویل تک وابستہ رہنے کے علاوہ اکبر صاحب کی شخصیت کا ایک مثبت پہلو یہ بھی تھا کہ قدرت نے انہیں زود گوئی اور فی البدیہہ شعر کہنے کا ملکہ ودیعت کیا تھا۔ خود اکبر صاحب نے اور ان کی شاعری پر اظہارِ خیال کرنے والے اہلِ قلم حضرات نے، ان کی زود گوئی کا اعتراف کیا ہے۔ با ایں ہمہ جب ہم اکبر جے پوری کے تمام مجموعہ ہائے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے شاعرانہ کمالات کا اندازہ تو ہوتا ہے لیکن ان کی زود گوئی و بسیار نویسی کی نشاندہی نہیں ہو پاتی ہے۔ اس کا سب سے واضح ثبوت یہ ہے کہ اکبر صاحب کے اولین شعریہ مجموعے "شمعِ فروزاں" (۱۹۵۴ء) سے لے کر "چمن زار" (۱۹۹۸ء) تک شائع ہونے والے ہر ایک مجموعہ کلام میں سابقہ شعری مجموعے کا کلام بھی

شامل ہوتا رہا ہے۔ بلاشبہ کسی بھی فنکار کی عظمت کا تعین اس کے شعری سرمائے کی کمیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کی کیفیت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ تاہم تخلیق کار کی قدر و منزلت کی بنیاد اصلاً اس کا خلق کردہ سرمایۂ سخن ہی بنتا ہے۔ اکبر جے پوری کی تمام تر متاعِ سخن کے محفوظ نہ ہونے کے دراصل کئی اسباب ہے۔ مذکورہ بالا سطور میں ایک خاص سبب کا ذکر ہو چکا ہے کہ اکبر صاحب کو اپنے جیل کے واقعہ اور عدالتی چارہ جوئی کے سلسلے میں تقریباً پندرہ برسوں تک نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا اور ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کیلئے انہیں اپنی تخلیقات سے بھی مدد لینی پڑی۔ ہمارے کئی شعراء ہر دور میں ایسے مسائل سے دوچار ہوتے رہے ہیں، اس کے علاوہ شوقِ شاگرد نوازی و شاعرگری کے سبب بھی اکبر صاحب کا کلام دوسروں کے نامۂ اعمال میں جمع ہوتا رہا، ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں ان کی اپنی عدم توجہی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اکبر صاحب نے خود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''درجنوں احباب کو لکھ لکھ کر دیا اور وہ عوام سے شاعری کی سند پاتے رہے، بہت سے مانگ کر لے گئے، کئی ایک نے فرمائشی نظمیں لکھوائیں اور کرم فرما اُڑا لے گئے اور بڑی ہی ''خوش اخلاقی'' سے اپنا لیا لیکن میرے کلام کا زیادہ تر حصہ میری عدم توجہی اور لااُبالی پن سے ضائع ہو گیا، ایک تو اسی خیال سے کہ کوئی قابلِ قدر سرمایہ نہیں ہے، میں نے حفاظت نہیں کی۔ دوم یہ گمان نہ تھا کہ کبھی ایسا وقت آئے گا کہ ماضی کے افکارِ پریشان کو دیکھنے کا شوق ہوگا اور منتشر اوراق کی

ترتیب وتالیف کی ضرورت کا خیال آئے گا، سازِ دل خاموش ہوگیا تو اس کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو جوڑ کر دلدوز نغمے سنانے کی تمنا دل میں کروٹیں لینے لگی۔ اپنے حافظے پر زور دے کر جو کچھ یاد آیا لکھ دیا، کچھ بکھرے ہوئے کرم خوردہ اوراق کو کھنگالا، اس طرح ایک ضخیم دفتر اکٹھا ہوگیا، گویا آشیاں اُجڑنے کے بعد منتشر تیلیوں سے طرحِ نو ڈالی'' ۶

غرض کہ اکبر جے پوری نے اپنی زندگی میں جتنا شعری سرمایہ تخلیق کیا، اصلاً وہ خود اس کی قدر اور حفاظت نہیں کر سکے۔ ظاہر ہے اس میں دوسروں سے زیادہ خود اکبر صاحب کی شانِ بے نیازی ہی کا دخل رہا ہے۔ بایں ہمہ اکبر صاحب کا جتنا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شعری سرمایہ موجود ہے، وہ بہر کیف کشمیر کی ادبی تاریخ میں ان کے نام کو زندہ رکھنے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اکبر جے پوری نے یوں تو نظم اور غزل دونوں اصناف میں قابلِ مطالعہ سرمایہ یادگار توڑا ہے لیکن اس مضمون میں ہماری بحث کا دائرہ ان کی غزل گوئی تک محدود ہے۔

اکبر جے پوری کی شاعری کی ابتداء جے پور کی کلاسکی شعری روایت کی فضا میں ہوئی۔ آزادی سے قبل جے پور میں بڑے بڑے اساتذۂ فن موجود تھے اور پابندی کے ساتھ ''طرحی مشاعرے'' اور عزاداری کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں (یہ روایت آج بھی زندہ ہے) اکبر کی شاعری اُسی ادبی وشعری تناظر میں پروان چڑھی، چنانچہ اپنے شعری سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے اکبر خود رقمطراز ہیں:

''غالباً چودہ پندرہ برس کا سن ہوگا کہ مجالس عزا میں بیتیہ اشعار سُنانے اور

ماتمی دائروں میں نوحے پڑھنے کا شوق تھا جس نے میرے سیدھے سادے خیالات کو سوز و نیت کی شکل دی۔ کرئی اسکول اور کالج میں میگزین کی ادارت نے کچھ کہہ لینے اور شائع کرانے کی ترغیب دلائی۔ مشاعروں میں ہلّڑ مچانے اور دِل بہلانے کیلئے ہم سِن لڑکوں کی ٹولی کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک طرحی مشاعرہ میں چند اشعار سُنائے تو حوصلہ بڑھا۔ جے پور کی ادبی فضا میں مشاعرے سال میں دس بار ہوا کرتے تھے۔ ہر مشاعرے میں شمولیت کو اپنا معمول بنالیا۔ عام طور پر طرحی مشاعروں کا رواج تھا۔ ایک مشاعرہ میں اپنے ہمسایہ اُستاد، امامِ فن، ناظم الملک سید معشوق حسین اطہؔر ہاپوڑی نے پہچانا اور گھر بُلایا۔ بدنصیبی سے یہ شرفِ تلمذ دو سال سے زائد قائم نہ رہ سکا اور گردشِ تقدیر مجھے اپنے آبائی وطن کشمیر لے آئی'' ۷

اطہؔر ہاپوڑی جے پور کے معروف اساتذہ سخن میں شمار ہوتے تھے، ان کا اپنا خاص طریقہ اصلاح تھا۔ اکبؔر جے پوری کی ابتدائی مشقِ سخن اور اطہؔر ہاپوڑی کے طریقِ اصلاح کے متعلق جناب سرورؔ تونسوی لکھتے ہیں:

''اکبؔر نے ان سے (اطہر ہاپوڑی) علم و عروض و قافیہ سیکھا، مولانا روزانہ ایک مصرعہ دیا کرتے تھے اور اکبؔر تیس چالیس اشعار کی غزل لکھ لاتے، اصلاح کی وجہ پوچھتے، زود گوئی اور فی البدیہہ کہنے کا ملکہ بچپن سے تھا۔ اساتذۂ فن خصوصاً میؔر، غالبؔ، مومنؔ، اصغرؔ، حسرتؔ اور آتشؔ کے کلام کا مطالعہ کیا۔ رفتہ رفتہ استاد کے مصرعِ ثانی پر مصرعِ اولیٰ لگا کر مشق کرتے رہے''۔ ۸

اطہر ہاپوڑی دراصل جوہر شناس استاد تھے، انہوں نے اپنے زمانے میں جے پور کے متعدد شعرا کی ذہنی تربیت کی۔ اکبر صاحب کو اگرچہ استاد سے استفادہ کرنے کا زیادہ موقع نہیں مل سکا، تاہم انہوں نے دو سال کی مشاقی میں شاعری کے بنیادی رموز و نکات کی کسی قدر معلومات حاصل کر لی تھی، جو ان کے تخلیقی سفر میں معاون ثابت ہوئی۔ اطہر ہاپوری کے بعد اکبر صاحب نے باقاعدہ طور پر کسی کو اپنا اُستاد نہیں بنایا، کشمیر جا کر وہ خوس استادِ سخن بن گئے اور اہل وہ نا اہل ہر قسم کے شاگردوں کو فیض پہنچاتے رہے۔

جے پور میں منعقدہ ہونے والے ''طرحی مشاعروں'' میں پابندی کے ساتھ شرکت اور اطہر ہاپوڑی صاحب کے فیضانِ تربیت کے سبب اکبر جے پوری کی شاعری میں شروع سے ہی روایت و کلاسکیت کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے، سازِ شکستہ (۱۹۶۶ء) کی اشاعت تک ان کے یہاں ''روایت و کلاسکیت'' کا رنگ نسبتاً زیادہ نمایاں ہے۔ ساتھ ہی رومانیت کی پرچھائیاں اکبر صاحب کی تمام و کمال شاعری (نظم و غزل) میں از اول تا آخر اپنا جادو جگاتی رہتی ہیں۔ چنانچہ اکبر جے پوری کی شاعری کے متعلق بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی نے لکھا ہے۔

''ان کی (اکبر کی) غزلیں روایاتی ہیں، ان کا انداز پرانا ہے اور اس کیلئے وہ ذمہ دار بھی نہیں ہیں، وہ ایسے ماحول میں پلے اور اُٹھے بیٹھے جس میں اس وقت کا رنگ مقبول تھا۔ وہی رنگ اکبر نے بھی اختیار کیا...... جناب اطہر کے کلام کا جو رنگ تھا وہ کس کو معلوم نہیں۔ اپنے زمانے میں بڑے جاندار غزل گو شمار کئے

جاتے تھے۔ بڑے شریف النفس اور جوہر شناس بزرگ تھے، خود اپنی جگہ استادِ فن تھے۔ اسی سے اکبرؔ پر جنابِ اطہرؔ کی صحبت کا کافی اثر پڑا اور اُن کی غزل بیشتر جناب اطہرؔ کے رنگ میں رنگ گئی'' 9

کلاسکی غزل کی جمالیاتی فضا، تغزل کی سرشاری، جذبات اور احساسات کے اظہار و بیان کے متوازن اسلوبِ سخن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ کلاسکی شعرا نے عشق و جنون کے علاوہ اخلاقی اور فکری فضا میں جس کثرت اور جس انداز سے بیان کئے ہیں۔ ان میں زندہ رہنے کی تب و تاب موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں اس حقیقت کا اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ کلاسکی شاعری کا اپنا عہد و ماحول اور مخصوص اقدار و روایات رہی ہیں، جن میں وہ پروان چڑھی ہے۔ لیکن چونکہ زندگی ایک نامیاتی حقیقت ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کی روایتیں، قدریں اور فکر و نظر کے زاویئے بدلتے ہیں نیز انسان کے احساسات اور افکار میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حیات و کائنات کے تغیرات کے ساتھ ساتھ دنیائے شعر و ادب کی ترجیحات و فکریات اور اسالیبِ بیان میں بھی تبدیلی و ترقی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، کسی فنکار کے یہاں اگر احساس و افکار اور اسلوب کی سطح پر تغیر و ترقی کا یہ فطری عمل موجود نہ ہو تو اس کے شعری عمل میں جمود اور غرابت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ جہاں تک اکبرؔ کی شاعری کا تعلق ہے، ان کے یہاں روایتی اور رسمی مضامین کثرت سے ملتے ہیں،

لیکن یہ رنگِ سخن ان کی شاعری کا محض ایک حصہ ہے۔ اکبرؔ کی غزل میں دراصل روایتی مضامین اسلوب کی تازگی و تصمیم کے لحاظ سے مستحسن معلوم ہوتے ہیں، ان میں احساس کی شدت بھی ہے اور جذبات کی حرارت بھی، تخیل کی رعنائی بھی ہے اور مضمون آفرینی و کیفیت سازی کا عمل بھی۔ اکبرؔ کی غزل میں اصلاً تغزل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تغزل کا وہ رنگ، جو مومنؔ، حسرتؔ، اور فراقؔ کے یہاں خاص کر نمایاں ہے، اکبرؔ کی غزل میں بہاریں دکھاتا ہے۔ شعری تغزل آمیزی میں اکبرؔ کی ''رومانیت پسندی'' کو بھی خاصا دخل رہا ہے، جو اُنکی شاعری میں سائے کی طرح ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ذیل میں چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن کی روشنی میں اکبرؔ کی غزل کے کلاسکی اور رومانوی شعری اظہارات پر کسی قدر روشنی پڑ سکے گی۔

جہاں میں دھوم ہے حسنِ بتاں کی
یہ ہے شوخی مرے طرزِ بیاں کی

ترے کوچے میں آنکھیں دیکھتی ہیں
صفت سنتے تھے جو باغِ جناں کی

اس لئے دیکھتے ہیں آئینہ
آئینے پر نکھار آجائے

ہم ہیں، اغیار ہیں، شوخی ہے، تغافل ہے، وفا
ایک دنیا ہے جو پنہاں نگہہِ یار میں ہے

کیا کم یہ تری شوخ نگاہی کے کرم ہیں
آئینے میں سو رنگ ترے حسن کے ضم ہیں

کیا خوب عجب انداز سے کہتے ہیں وہ مجھ سے
سر پھوڑئے لیکن مری دیوار نہ ٹوٹے

باقی نہیں ہے کوئی بھی صحرا کا راز داں
خالی ہمارے بعد بیابان ہوگیا

دکھائیں گے تجھے آہوں کی شعلہ سامانی
تجھی کو پھونک کے اے آسمان دکھائیں گے

میری قسمت میں ازل سے عشق کی سرکار نے
دل بھی مجھ کو وہ دیا جو مبتلائے درد ہے

موجیں بھی بے قرار ہیں اس بت کی چاہ میں
داغِ حباب ہے دِل دریا لئے ہوئے

بن گیا آسمان کا تارا
جس پہ تم نے نگاہ ڈالی ہے

دل کی تپش کا نقطہ جو آیا عروج پر
اونچائیوں پہ قطرۂ سیلاب لے گیا

نبھنا محال تھا دِل کفر آشنا کے ساتھ
ظالم بتوں نے مجھ کو مسلماں بنا دیا

شوقِ جمالِ یار کی عمر خدا کرے دراز
وجہِ قرار بھی یہی ہستیِ بے ثبات میں

آرام وسکوں، قلب ونظر، دین اور ایماں
ہر چیز تری راہِ محبت میں لُٹا دی

عشق ہی حسن کی شہرت کا سبب ہے ورنہ
میں ستم کش نہ بنوں تو ستم ایجاد نہ ہو

ابھی چاہے تو ہو بیمار اچھا
نگاہِ چارہ گر ہم جانتے ہیں

دنیا تو دیکھتی ہے ذرا تم بھی دیکھ لو
اکبر چلا ہے چاک گریباں کئے ہوئے

یہ ہے حسرت شہیدِ الفت کی
کوئی سوئے مزار آجائے

یہ انقلاب محبت کے سب کرشمے ہیں
کہ سوزِ فرقتِ محبوب عین راحت ہے

خلشِ دل ہے نہ بیگانہ مزاجی نہ کسک
التفات آپ کا اب پہلے سے کم ہے کہ نہیں

ان کی نگاہِ ناز یہ دیتی ہے مشورہ
چھوٹے نہ ہاتھ سے کبھی دامانِ اضطراب

☆

اکبر جے پوری کی رومانویت اور کلاسکیت پسندی میں دو رائے نہیں، لیکن ان کی شاعری انہیں مضامین تک محدود نہیں ہے۔ ان کے یہاں اپنے عہد و ماحول کے سیاسی وسماجی حالات وکشاکش کا احساس بھی ملتا ہے۔ اکبر کی شاعری

کیا بتدا چونکہ آزادیِ ملک کی جدوجہد کے دوران ہوئی تھی، اس وقت ''ترقی پسندی'' شباب پر تھی اور زیادہ تر شعرا اپنے عہد کی اجتماعی زندگی کے مسائل و آلام کو اپنے فن کا حصہ بنا رہے تھے، اکبرؔ جے پوری کے یہاں بھی آزادیِ ملک کے دوران اُبھرنے والے سماجی مسائل و مصائب کا کسی قدر احساس موجود ہے۔ انہوں نے ''ترقی پسندی'' سے غیر وابستہ رہتے ہوئے بھی اس دور کی اجتماعی کشمکش اور شدائد کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ کلاسکی استعارات و علامات کے توسط سے اکبرؔ نے اپنے عصری تفکرات کا اس طرح اظہار کیا ہے۔

بدلا ہت دور، سامنے مسئلے بہت ‌ ‌ ‌ ‌ اکبرؔ حکایتِ لب و رخسار چھوڑئے

اکبرؔ جدید رنگِ مضامیں دکھایئے ‌ ‌ ‌ ‌ یہ کیا جو لوگ کہہ گئے وہ آپ بھی کہیں

ہائے کیا گردشِ زمانہ ہے ‌ ‌ ‌ ‌ برق ہے ہم ہیں آشیانہ ہے

باغباں آمادۂ تخریب ہے ‌ ‌ ‌ ‌ ہر کلی سہمی ہوئی ہے آج کل

اے عندلیب اب تو قفس ٹوٹنے کو ہے ‌ ‌ ‌ ‌ فصلِ بہار آگئی دورِ خزاں گیا

کروٹیں لے رہی ہے ارضِ وطن ‌ ‌ ‌ ‌ انقلاب آفریں زمانہ ہے

یہ قفس کیا ہے چند تنکے ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ منتشر ہو تو آشیاں ہو جائے

چمن میں بجلیاں ہیں رقص فرماں ‌ ‌ ‌ ‌ الٰہی خیر میرے آشیاں کی

نہ کر شورِ اسیرانِ قفس کا باغباں شکوہ ‌ ‌ ‌ ‌ جو دل میں ہے خیالِ آشیاں مشکل سے نکلے گا

ملک کی آزادی کے ساتھ ''تقسیم وطن'' کے خونریز سانحے نے ہماری

صدیوں کی مشترکہ تہذیبی وتمدنی اقدار کے شیرازے کو جس سفاکانہ انداز سے منتشر کیا، وہ ہندوستان کی قومی تاریخ کا ایک خوں چکا باب ہے۔ تقسیم کے اس قیامت خیز ماحول ومظاہر سے پیدا شدہ احوال وافکار کا اظہار ہمارے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے ساتھ ہی ساتھ شعرائے کرام کی شعری تخلیقات میں بھی موثر طریق پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ذیل میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ہر گام پہ کچھ مسلے ہوئے پھول ملے ہیں
ایسے تو مرے دوست گلستاں نہیں ہوتے ....احمد فرازؔ

دیکھو تو فریب موسمِ گل
ہر زخم پر پھول کا گماں ہے ....باقیؔ صدیقی

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے ....ناصرؔ کاظمی

دیکھتے دیکھتے مُرجھا گئے کمسن پودے
دیکھتے دیکھتے مُرجھا گئے کمسن پودے ....خلیل الرحمٰن اعظمی

منتظر دوست کے زوال کے ہیں
میرے احباب بھی کمال کے ہیں ....محشرؔ بدایونی

زندگی اتنی بھی بے درد نہ تھی
آگہی بول کہاں ہیں ہم لوگ ....خاطر غزنوی

نئے چہروں سے جی گھبرا رہا ہے
غنیمت تھیں پرانی صحبتیں بھی ....شہزاداحمد

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا ....احمدندیم قاسمی

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہوگئی ہے ....فراقؔ گورکھپوری

میں ہوں اور دشتِ غم کا سناٹا
کوئی آواز دور دور نہیں ....جگرؔ مرادآبادی

کیا خبر تھی بہار میں اب کے
چاک ہوں گے گلوں کے پیراہن ....شکیلؔ بدایونی

جہاں گردِ سفر بنتی ہے منزل
ہمیں رہبر وہیں ٹھہرا رہا ہے ....مظہرامامؔ

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے ....ناصرؔ کاظمی

☆

محولہ بالا اشعار سے آزادی کے بعد کی انفرادی واجتماعی زندگی کے درد وداغ اوراضطراب وابتلا کی کیفیت اوریارانِ وطن کی سردمہری کا پورا منظرنامہ تشکیل پاتا ہے، جو برِصغیر کے عوام اوراحساس ذہنوں کو متاثر و مجروح کئے ہوئے تھا۔ جہاں

تک اکبرؔ جے پوری کی شاعری کا تعلق ہے، ان کے ہاں بھی اپنے کلاسکی ڈکشن و اسلوب میں آزادی کے بعد غزل میں اُبھرنے والی ''جدید حسیت'' کا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہیں اپنے دور کے سیاسی، سماجی، اور اقتصادی مسائل و معاملات کا احساس وعرفان ہے۔ چنانچہ وہ اپنے حقیقت آشنا تخلیقی لمحات میں اپنے رومانی وکلاسکی موضوعات کی دنیا سے ذرا اوپر اُٹھ کر اپنی اجتماعی زندگی کے خزاں نصیب مناظر اور تلخ مسائل پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور عصری سچائی کو اپنے فن کا حصہ بناتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اکبرؔ جے پوری خود بھی آزادیِ وطن کے دوران اپنے وطن ہی میں ہجرت کے کرب سے گزرے تھے، انہیں ملک کے نامساعد حالات کے پیشِ نظر جے پور چھوڑ کر کشمیر جانا پڑا، چنانچہ یہاں کی بزم آرائیاں اور دل نوازیاں انہیں زندگی بھر یاد آتی ہیں، جس کا اظہار ان کے اشعار میں موجزن ہے۔

اکبر اگر چہ خلد ہے کشمیر کا چمن — جے پور کی جو یاد ستائے تو کیا کروں

آہ جے پور، رشکِ فردوسِ بریں — یاد ہے، جب تھا میں بھی تجھ میں مکیں

☆

علاوہ ازیں جنگِ آزادی کے دوران فرقہ وارانہ فسادات میں اپنے والد ماجد آغا علی عابدؔ کے سانحۂ قتل کا گہرا احساس بھی بہر کیف اکبرؔ کے یہاں موجود ہے۔ غرض کہ جے پور سے کشمیر ہجرت کے کرب اور والد کے قتل کے غم نے اکبرؔ کی شاعری کے شخصی غم میں اجتماعیت اور کائناتی غم میں ذاتی درد و کرب کا آہنگ پیدا

کردیا۔ اپنے عہد کے اس انفرادی اور اجتماعی درد وغم اور پائمالی کا شدید احساس اکبر جے پوری کی شاعری میں نمایاں ہے۔ انہوں نے آزادی کے بعد کے سیاسی وسماجی منظرنامے کا مشاہدہ کرتے ہوئے اپنے جدید اور حقیقت آمیز احساسات وافکار کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

رُت جو بدلی ہے تو گلزار بنا ہے صحرا — گل کا نقشہ ہے نہ اب بادِ صبا کی صورت

آرہی ہے پھر کسی اُجڑی ہوئی محفل کی یاد — عہدِ ماضی کو جگانے کی تمنا دل میں ہے

آتشِ گل سے باغ جلتا ہے — مل کے روتے رہے بہار سے ہم

رازدارِ چمن ہوں مدت سے — راس آئے گی کیا بہار مجھے

میرا آشیاں اکبر خاک ہوگیا تو کیا — دیکھ تو لیا گلشن روشنی میں لوگوں نے

مری نگاہ تھی خاموش شب کے منظر میں — کہیں زبانِ سحر نے حکایتیں کتنی

پھول چپ ہیں فسردہ ڈالی ہے — عام احساسِ پائمالی ہے

امید کی کرنوں میں ہے یاس کی تاریکی — لپٹی ہوئی صبحوں میں اک زلفِ شبانہ ہے

کام لیتے ہیں گل کا خار سے ہم — اتنے مانوس ہیں بہار سے ہم

دھوپ میں جھلسے ہوئے ہیں راستے — آبلہ پا زندگی ہے آج کل

ہے فروزاں مسئلوں کی مشعلیں — روشنی ہی روشنی ہے آج کل

کھول کر دیکھ دیدۂ عبرت — کیا زمانہ تھا کیا زمانہ ہے

رُک گئی میرے لئے کیا گردشِ لیل ونہار — میرے ارمانوں کی دنیا میں ابھی تک شام ہے

اکبر کا سیاسی و سماجی شعور بیدار ہے، وہ اگر چہ ''ترقی پسند تحریک'' کے نظریات کے مبلغ نہیں رہے، لیکن ایک حساس اور سنجیدہ فنکار کی حیثیت سے انہوں نے اجتماعی مسائل و تفکرات کو اپنی فکر کا حصہ بنایا ہے، ساتھ ہی سیاستِ وقت کے سفاک طرزِ عمل کا شعری ردِّ عمل اور احتجاج بھی اکبر کے ہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر چہ اس دوران ان کی شاعری میں قدرے ''جذباتیت'' اُبھر آئی ہے مگر یہ رنگِ سخن آزادی کے بعد سے ''جدیدیت'' کی عمل آوری تک بیشتر شعرا کے یہاں نمایاں ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار دیکھے جاسکتے ہیں۔

مسافروں کے بھٹکنے کا کوئی بھی الزام — نہ راہزن کوئی لے گا نہ راہبر لے گا

جن کی عمل سے منزلیں بے نام ہوگئیں — ان کا بھی نام لکھا گیا رہنماؤں میں

کوئی حاجت روا نہیں ملتا — زندگی آج بھی سوالی ہے

اکبر خزاں نصیب بہاروں کا قافلہ — آنکھوں سے ایک منظرِ شاداب لے گیا

صورتِ منزل پہ اکبر چھا گئی گردِ ملال — کچھ کدورت آگئی ہے رہبروں کے درمیاں

حالات کے گہرے دریا میں اک شورشِ طوفاں آج بھی ہے
تسکین کے ساماں کل بھی نہ تھے اور کشمکشِ جاں آج بھی ہے
ناداریِ مزدور آج بھی ہے، مجبوریِ انساں آج بھی ہے
کل تک تھی دلوں میں جس کی خلش وہ خارِ بیاباں آج بھی ہے

لب پر ہیں محبت کے نغمے اور دل میں ہوس کے انگارے
تعمیر کے زریں خوابوں میں تخریب کا ساماں آج بھی ہے

☆

آزادی کے بعد اردو شاعری میں ''ترقی پسندی'' کے ردِ عمل کی صورت میں ۱۹۶۰ء کے آس پاس ''جدیدیت'' کو فروغ حاصل ہوا، جس کے پسِ پشت دراصل ''وجودیت'' کے علم بردار فلسفیوں مثلاً کرکے گارد، ہائیڈیگر، سارترے، اور کامیو وغیرہ ہم کے افکار کارفرما تھے، وجودیت کے بنیادی نظریات میں انفرادیت، داخلیت، احساسِ مرگ وشکست اور لایعنیت کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ ''جدیدیت'' سے وابستہ ادباء شعرا نے جہاں تخلیقی آزادی، فنی کیفیت اور زبان کی تخلیقی صورت گری کے سلسلے میں اچھے نمونے پیش کئے وہیں ''مغربی جدجدیت'' اور وہاں کے جدیدیت پرست اُدباؤ شعرا کی تقلید میں حد سے بڑھی ہوئی داخلیت، مادیت، اجنبیت، یاسیت، احساسِ تنہائی، شکستِ ذات، احساسِ جرم اور نفسیاتی الجھنوں کو اس درجہ فروغ دیا کہ ان کی تخلیق کاری مغربی جدیدیتکی ''تقلید کاری'' کا نمونہ معلوم ہونے لگی۔ اپنے ذہنی ونفسیاتی مسائل اوت پیچیدہ جذبات وخیالات کے اظہار وبیان کیلئے ان شعرا نے اسلوب کی سطح پر اشکال واہمال کو بھی بڑھاوا دیا۔ لہٰذا ان کی شاعری کا رشتہ ہماری اجتماعی زندگی سے منقطع سا ہو کر رہ گیا اور ان کے فن پارے صرف نام نہاد ''جدید ناقدین'' کی دلچسپی اور نگاہِ توجہ کا مرکز بن کر رہ گئے۔ مگر اس دور میں بعض ایسے

شعرا بھی ملتے ہیں جنہوں نے ''مغربی جدیدیت'' کی تقلید کاری کے بجائے اپنے عہد و ماحول کے نئے سماجی، تہذیبی اور ارضی منظرنامے کو اپنا مرکزِ سخن بنایا۔ صنعتی و مادی تہذیب سے جو مسائل اجتماعی زندگی میں اُبھر کر سامنے آئے ہیں، انہیں شعرائے جدید نے انفرادی طور پر متوازن انداز و اسلوب میں پیش کیا ہے، اکبر جے پوری انہیں آخر الذکر شعرا کے زمرے میں شامل ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں اپنے عہد و سماج کا جو ذہنی و جذباتی رویہ دیکھا اور محسوس کیا ہے، اسے اپنے شعری عمل کا حصہ بنانے کی سعی مشکور کی ہے۔ سیاستِ وقت کی سفاکانہ روِش، یارانِ وطن کی سرد مہری، بے رحمی اور منافقت آمیز ذہنیت سے انہیں جن مسائل اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے، اس کا اظہار اکبر کی شاعری میں ذاتی اور انفرادی طرزِ احساس کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے، سماجی و تہذیبی سطح پر اُبھرنے والے اجتماعی مسائل حیات کا کرب و گداز بھی ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اکبر کی شاعری میں شکستِ ذات، اجنبیت، یاسیت، اور خوف کا جو احساس موجزن ہے، وہ تقلیدی اور مصنوعی قسم کا نہیں بلکہ اپنے عہد کی زندگی کے عمیق مشاہدے، گہرے تجربے اور تلخ حقائق کی بنیادوں پر استوار ہے، ذیل کے اشعار سے ہمارے خیال کی توثیق ہو سکے گی۔

روز پتھر مرے آنگن میں گرا کرتے ہیں
میرے ہمسائے مجھے یاد کیا کرتے ہیں

ہم دوستوں کی طرح رہے ساتھ عمر بھر
یہ بھی نہیں کہ معرکہ آرائی کم ہوئی

دشمنوں کو میں کر رہا تھا تلاش
آپ نے کیوں چھپا لیا چہرہ

ہر منظرِ حیات میں بے چہرگی سی ہے
تاریکیاں بڑھی ہیں نہ بینائی کم ہوئی

دیکھ کر میرے دل کی بربادی
کون سی آنکھ تھی جو نم نہ ہوئی

بڑی مدتوں سے اکبرؔ سرِ رہ گزر پڑا ہوں
نہ کسی نے مجھ سے پوچھا کبھی پیار کی زباں سے

دے گئے ذہن کو سوغات میں گردِ احساس
قافلے شب کے جو دامانِ سحر سے گزرے

رہنے بھی دے اے فریبِ کائنات
سب سمجھتا ہوں میں تیرے التفات

اس میں کوئی تاثرات نہ تھے
جیسے چہرے کے پیچھے تھا چہرہ

اب شہر ہیں ویرانے باہوش ہیں دیوانے
آتے ہیں نظر اکبرؔ آثار قیامت کے

☆

شعری پیکر تراشی اور کیفیت سازی کے تخلیقی رموز سے متصف کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں جو اپنے عہد کے شور و شر اور اضطرابِ حیات کی موثر ترجمانی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

یہ دکھ نہیں ہے گھر کی جو انگنائی کم ہوئی
دیوار کھنچنے سے شناسائی کم ہوئی

موسم بدلنے والا ہے، یہ بھی جھلس نہ جائیں
بیٹھے ہیں چند لوگ چناروں کی چھاؤں میں

تشنگی دھوپ، وفا، کرب، سلگتے خیمے
ایسے منظر بھی میرے دیدۂ تر سے گزرے

خزاں، اُداس فضا، شامِ غم، شفق، شبنم
مجھے سمجھنے کو ہوں گی علامتیں کتنی

لب ہیں خاموش تو آنسو بھی نہیں آنکھوں میں
کس طرح اپنی تمناؤں کا اظہار کریں

نئی غزل کا ایک اہم موضوع احساسِ تنہائی بھی ہے۔ آزادی کے بعد کی شاعری میں بھی یہ احساس نمایاں ہے، لیکن آج کے مادی و صنعتی سماج نے تمام انسانی قدار و ایقان متاثر کئے ہیں۔ ہر فرد اپنی ذات کے خول میں مقید، اپنے ہمسائے سے بے خبر اور اپنی روح کے عذاب میں گرفتار ہے۔ وہ جس عہد میں سانس لے رہا ہے، اس نے اس کے دل میں نارسائی، شکست اور افتادگی کا احساس جاگزیں کر دیا ہے۔ ہر انسان اپنی راہِ حیات کا تنہا مسافر ہے، اس کا کوئی مددگار اور غمگسار نہیں۔ ان تمام عوامل سے ہر حساس، انسان و فنکار کے ذہن و دل میں احساسِ تنہائی نمایاں ہے۔ ان کا احساسِ تنہائی ذاتی اور انفرادی ہے۔ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں وہ یارانِ وطن کی سفاکیوں کا ہدف بنے رہے، وقت کی بے قدری اور دنیا کی بے اعتنائیوں نے اکبر جے پوری کو گوشۂ گمنامی میں پڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔ غرض کہ "جن لوگوں کو اکبر نے بانکپن عطا کیا تھا، ان ہی سے انہیں زیادہ دکھ پہنچے اور زخم لگے"۔ [۱۰]

مذکورہ حالات و حوادث نے اکبر کی زندگی میں ایک گونہ تنہائی و پسپائی کا احساس پیدا کر دیا۔ چنانچہ اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ بہت زیادہ تنہائی پسند ہو گئے تھے۔ ذیل کے اشعار میں احساسِ تنہائی اور متعلقاتِ تنہائی کے حسی پیکر ملاحظہ ہوں ؎

حیرت انگیز تھا عالم مری تنہائی کا — ظلمتِ شب پہ ستاروں کا بھی احساں نہ رہا
کیا قیامت ہے کہ آج اپنے ہی گھر میں اکبر — کوئی مونس، کوئی ہمدم، کوئی پرساں نہ رہا

اصرار ہے کہ موت کو ہم زندگی کہیں تنہائیوں کے کرب کو کیسے خوشی کہیں

کوئی نغمہ نہ فغاں ہے اکبر سازِ دل اس قدر ہے کیوں خاموش

ہم انجمن بدلتے رہے ساری زندگی اکبر کسی طرح سے نہ تنہائی کم ہوئی

اکبر کا شامِ غم میں دیا آنسوؤں نے ساتھ کرتا رہا چراغ فروزاں نئے نئے

بڑی مدتوں سے اکبر سرِ رہ گذر پڑا ہوں نہ کسی نے مجھ سے پوچھا، کبھی پیار کی زباں سے

دشتِ غم میں تنہا تھا میں سکوت کی صورت ڈھونڈ لی ہیں آوازیں خامشی میں لوگوں نے

احساسِ تنہائی کے ساتھ کلامِ اکبر میں ایک کرب انگیز اور یاس آمیز کیفیت بھی دیکھنے کو ملتی ہے، ستم ہائے روزگار نیا نہیں کچھ زیادہ ہی آزمایا اور ستایا تھا۔ ان کے کلام کی کربناکی میں اضافے کا ایک اہم محرک ''غمِ جاناں'' بھی ہے۔ اس طرح غمِ روزگار اور غمِ یار نے مل کر اکبر کے دل حساس کو مجروح اور ملول کر کے رکھ دیا۔ درج ذیل اشعار سے اس پہلو پر کماحقہ روشنی پڑتی ہے۔

دشمن بنی ہوئی ہے دِل پُر سکون کی دل میں کسی کی یاد بھی ہر غم کے ساتھ ساتھ

حسن دیتا ہے یہ سوغات تجھے کیا معلوم عشق کا نام ہے صدمات تجھے کیا معلوم

یاد آتی ہے کسی کی تو نکل جاتے ہیں اشک کس طرح ہوتی ہے برسات، تجھے کیا معلوم

سرمایۂ حیات جلایا خوشی کے ساتھ غم نے ہمیں حریفِ دل و جاں بنا دیا

سوز و گداز و یاس والم سے ہے جس کو کام ایسا جہاں میں عشق کا مارا کہیں تو ہو

سو بار میں سناؤں گا رودادِ رنج و غم ہوں گے مرے فسانے کے عنواں نئے نئے

پڑھنا اُسے تو حسنِ بصیرت کی بات تھی وہ حرف حرف اپنے غموں کی کتاب ہے

سخت بے رحم ہے، بیدادِ زمانہ اکبرؔ
کس بھروسے پہ یہاں درد کا اظہار کریں

روشن ہیں دل کے داغ بھی اکبرؔ جگر کے ساتھ
پھیلی ہوئی ہے آگ چمن در چمن ابھی

دل میں جو کچھ مرے گزرتی ہے
جس سے کہہ دوں وہ نوحہ خواں ہو جائے

ازل سے اکبرِ حزیں تجھے ملے ہیں غم ہی غم
ترے لبوں پر کیوں خوشی تلاش کر رہا ہوں میں

☆

غرض کہ عشق کے صدمات اور ستم ہائے دوراں نے مل کر اکبرؔ کے حریمِ جاں کو شعلہ ہائے غم سے روشن کر دیا، چنانچہ ان کی شاعری میں کرب و یاس کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اکبرؔ کے ہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں ہجومِ غم میں مسکرانے اور ناکامیوں و نامرادیوں میں امید و ایقان کی کرن تلاش کرنے کا عزم و حوصلہ ملتا ہے۔ ان کے یہاں مایوسی اور مشکلات کے عالم میں بھی جہدِ حیات کا جذبہ اور ولولہ سرد نہیں پڑتا۔ شاہراہِ حیات پر نئی آرزوؤں اوت نئے خوابوں کے ساتھ گامزن رہنے سے ہی ان کے نزدیک زندگی میں کامرانیوں اور شادمانیوں کا حصول ممکن ہے، بحرِ غم و اندوہ سے ہی بالآخر کیف و مسرت کا چشمہ بھی پھوٹتا ہے۔ ایسے تجربات کسی بھی فنکار کے یہاں دشتِ غم کی تپش میں محوِ سفر رہنے اور موجِ حوادث سے ٹکرانے کے بعد ہی جنم لیتے ہیں۔ اکبر جے پوری کت شعری تجربات بھی زندگی کی تلخیوں اور مصائب کے کوہِ گراں کو اپنے قلب پر جھیلنے ہی سے ظہور میں آئے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں ۔

اکبر ملال دردِ مسلسل نہ کیجئے — بنتا ہے درد آپ ہی درماں کبھی کبھی

غم کی لطافتیں دلِ اکبر سے پوچھئے — مجھ کو حریفِ گردشِ دوراں بنا دیا

ہر شام کے پردے میں ہوتی ہے سحر پنہاں — مرنا مری نظروں میں جینے کا بہانہ ہے

طوفان کے دامن میں، ساحل کا سکوں بھی ہے — موجوں کے تلاطم میں ساحل کے بھی رستے ہیں

کبھی حیاتِ غمِ انبساط میں اُلجھی — کبھی سلاسلِ آلام سے گزر آئی

میری ہر سانس میں اک شعلۂ غم ہے کہ نہیں — زندگی مجھ سے محبت کا بھرم ہے کہ نہیں

کاٹ ڈالے ہم نے ہنس ہنس کر مصائب کے پہاڑ — زندگی کا بوجھ کیا تھا امتحانِ دوش تھا

دولتِ غم کے سوا پاس نہیں کچھ اکبر — ایسا مفلس کوئی دنیا میں کہاں ہوتا ہے

اچھا ہوا کہ زندگی بوجھ ستم کے سہہ گئی — جینا بڑا عذاب تھا گردشِ کائنات میں

تھوڑی سی مصیبت پر ہے اشک فشاں اکبر — ہنس دیتے ہیں غم میں بھی دنیا میں جگر والے

☆

اکبر جے پوری کی شاعری ہجومِ غم میں مسکرانے اور آلامِ روزگار میں یک گونہ مسرت حاصل کرنے کے تصور تک ہی محدود نہیں، یہاں رہگزارِ حیات میں حائل دشواریوں کی مقاومت کا حیات بخش احساس بھی ہے۔ کارزارِ حیات میں سرخرو ہونے کیلئے انسان کو باطل قوتوں سے مقاومت کے ساتھ ساتھ تاریخ کی جبریت پر غالب آنے کیلئے مجاہدہ از بس ضروری ہے کہ یہ اقتضائے حیات بھی ہے اور آدمِ خاکی کی پوشیدہ قوتوں کو برائے کار لانے کی تدبیر مستحسن بھی۔ کلامِ اکبر میں ایسے درجنوں اشعار موجود ہیں جو خود ان کی زندگی کے نشیب و فراز اور سرد و گرم کی داستان بھی بیان کرتے ہیں اور قاری کو کشا کشِ حیات سے نبرد

آزمائی اور مقاومت کا حوصلہ بھی فراہم کرتے ہیں۔

وہ جواں مرد جنہیں آتا ہے جینے کا شعور — موت کے آہنی ہاتھوں میں جیا کرتے ہیں
کاروانِ فکر کا ہم رُخ بدل سکتے نہیں — حق کو ہم نے حق کہا ہے خنجروں کے درمیاں
طوفاں سے گھبرائیں ہر موج سے ٹکرائیں — تقدیر کی زُلفوں میں تدبیر کا شانہ ہے
مسکرا کر ہم نے کاٹے ہیں مصائب کے پہاڑ — زندگی کا بوجھ کیا تھا امتحانِ دوش تھا
کیا سرد ہوگا جذبۂ دار و رسن ابھی — بامِ انا پہ ہنستا ہے دیوانہ پن ابھی
پتھر کی چٹانوں پہ کبھی وار نہ کرنا — سفاک، کہیں تیری یہ تلوار نہ ٹوٹے
زندگی موت کی علامت ہے — ڈرنے والے نہیں ہیں دار سے ہم
تو مری منزل رسی پر شک نہ کرائے ہمسفر — قوتِ عزم و عمل بھی ہے پروں کے درمیان
جب چہرۂ گیتی پہ پڑے شام کے سائے — ہم وقت کے ماتھے کی شکن بن کے رہے ہیں

☆

تاریخ کے جبرے سے مقاومت کی یہی سکت ہے جو اکبر جے پوری کی شاعری میں امید وایقان کا چراغاں کئے ہوئے ہے، وہ زندگی کے شدائد ومسائل سے پریشان اور متزلزل تو ہوتے ہیں لیکن اپنی پسپائی کا ماتم نہیں کرتے، لہٰذا ان کے ہاں یاسیت اور قنوطیت کی بجائے رجائیت کی روشنی ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، یہ رجائی آہنگ ان کی شاعری میں زندگی کرنے کی رمق وآرزو پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ اور دل تباہ میں نئی امیدوں کا چراغاں کرتے ہوئے تمناؤں کی دنیا آباد کرتا ہے۔ زندگی کی خوشحالی اور بلندی کے خواب دیکھنا رومانی شعرا کا

خاص وطیرہ رہا ہے۔ چنانچہ اکبر جے پوری بھی زندگی کے تاریک مناظر میں نورِ سحر کی جستجو وآرزو کرتے ہیں۔ اس سلسلے کے چند اشعار دیکھئے ۔

یارب یہ دل ہے یا کوئی ایوانِ اضطراب
بجھتے نہیں ہیں دل میں تمناؤں کے چراغ

رکھتا ہوں شوقِ شرکتِ ہر انجمن ابھی
مجھ سے مرے مزاج کی رنگینیاں نہ پوچھ

مگر میں صبح کا منظر تلاش کرتا ہوں
افق پہ رات کی تاریکیوں کے پہرے ہیں

قلبِ خود دار پہ یہ ذکر گراں ہوتا ہے
مجھ کو ناکامیِ الفت کے فسانے نہ سنا

ہیں ابھی تک پھر بھی آثارِ حیات
شہرِ دل ویراں ہوئے مدت ہوئی

میں نے صحراؤں کو بخشے ہیں سمندر کتنے
دیکھ کر تشنہ لبی میری تعجب نہ کرو

میں قطرہ ہو کے سمندر تلاش کرتا ہوں
مری جسارتِ دل دیکھئے تو اے اکبر

ہم کو کیا کیا دیکھنا تھا اور کیا کیا دیکھتے
چند روزہ زندگی تھی اور منظر بے شمار

☆

اُردو شاعری میں شروع سے ہی مثنوی، رُباعی، قطعہ، مرثیہ میں خاص کر اخلاقیات اور انسان دوستی کے افکار کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ ہماری کلاسیکی اور جدید غزل میں بھی کسی قدر انسانیت، اخوت، مساوات اور بقائے باہمی کے احساسات وافکار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اکبر جے پوری نے جہاں کلاسکی شاعری کے اخلاقی پہلو سے استفادہ کیا ہے وہیں اپنے انسانیت واخوت پسند جذبات واحساسات کا مخلصانہ اظہار بھی کیا ہے، وہ دیر وحرم کی تہذیبی روایت اور تقدس کے قائل ہیں اور ایک صحت مند معاشرے کیلئے دونوں کا تحفظ وتعظیم ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ذیل کے اشعار اسی نکتۂ فکر کے

مظہر ہیں۔

شہر ویران جو ہو جائیں تو بس جاتے ہیں　　دل اُجڑ جائے تو برسوں میں بھی آباد نہ ہو

تہذیب و تمدن کا اُجالا ہے ہمیں سے　　تابندگیِ گنگ و جمن بن کے رہے ہیں

محبت ہی حیاتِ جاوِداں ہے　　قسم مجھ کو حیاتِ جاوِداں کی

کام آئے گا تیرے محشر میں　　کوئی احسان کسی پر کردے

کفر و ایماں کے روابط سے تو حیراں کیوں ہے　　ہر جگہ سلسلۂ دیر و حرم ہے کہ نہیں

ہر وادیِ پُر خار کی ہر راہ گزر میں　　ہر گام پہ اک شمع محبت کی جلادی

دشمن سے بھی کر دوستی اکبر تو جہاں میں　　یہ رشتۂ اخلاص خبردار نہ ٹوٹے

اک، سازِ محبت ہے اکبر کا دِل زخمی　　جو شعر غزل کا ہے رنگین ترانہ ہے

بھر آتا ہے دل دیکھ کر ویرانہ کسی کا　　اس طرح نہ برباد ہو کاشانہ کسی کا

کعبہ کا احترام عبادت سے کم نہیں　　دل کعبۂ یقیں ہے کبھی دل نہ توڑیئے

مل جل کے اب جلائے تعمیر کے چراغ　　کیوں سنگِ اختلاف سے قسمت کو پھوڑیئے

محبت بے نیاز خار و گل ہے　　یہاں چلتی نہیں سود و زیاں کی

ازل سے تا ابد ہے سلسلہ حسنِ حقیقت کا　　محبت زندگی کی قید سے آزاد ہوتی ہے

☆

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ''رومانیت'' اکبر جے پوری کی شاعری کا نمایاں رنگ ور جحان رہا ہے۔ اس کے اثرات ان کے یہاں اول سے آخر تک دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اکبر جے پوری کی رومانیت میں درحقیقت تخیلی باتیں نہیں، یہاں جو

کچھ بیان ہوا ہے وہ شاعری کی قلبی واردات اور ذہنی و جذباتی تموج کی پیداوار ہے۔ اکبرؔ کی رومانیت کی بنیاد اصل میں عشق کی مادیت پر استوار ہے۔ اس لئے ان کی رومانی شاعری میں سوز و ساز، لطف و حزن، ہجر و وصال، ناز و نیاز اور بے تابی و سرشاری کے تمام حسی پیکروں میں آتشِ دِل کی تپش محسوس ہوتی ہے۔ اکبر جے پوری کی رومانی و عشقیہ شاعری میں خاص کر دو رنگ نمایاں ہیں، اول عشق و محبت کی جذباتی کیفیات کا بیان اور دوئم جمالیاتی احساس کا فطری و مادی اظہار۔ نئی غزل کے زیادہ تر شعراء نے اپنی شاعری میں محبوب کے حسن و جمال کی تعریف روایتی انداز میں نہیں، بلکہ نئے دور کے حسنِ نسواں کے بدلتے ہوئے رنگ ڈھنگ کے پیش نظر کی ہے۔ اسی طرح عشق کا تصور بھی اب روایتی و روحانی نوعیت کا نہیں بلکہ تمام و کمال مادیت آمیز ہے۔ چنانچہ اکبرؔ جے پوری نے اپنی غزل میں نئے نئے استعارات و علائم کے توسط سے حسنِ محبوب کے نو بہ نو جلوے عیاں کئے ہیں۔ ان کے محبوب کے حسن و جمال میں کشمیر کی ارضیت اور فطرت کے حسنِ دلنواز کے تمام حسی پیکر شامل ہو گئے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے اکبرؔ کے محبوبِ مجازی کی سراپا نگاری کا اندازہ ہوتا ہے۔

سڈول جسم کی سج دھج بہت نرالی ہے　　　شرابِ سرخ میں ڈوبی گلوں کی لالی ہے

لباسِ سرخ میں نکھراتری بہار کا رنگ　　　شفق کے سائے میں جیسے گلاب زار کا رنگ

جنبشِ ابروئے جاناں کے نثار　　کس قدر چلتی ہوئی تلوار ہے

وحشت نوازیاں ہیں ترے کیفِ چشم کی　　کچھ ہم سے وجہِ چاک گریباں نہ پوچھئے

دیکھا ہے وہ چہرۂ عرق ناک　　گل کیا عرقِ گلاب کیا ہے

گلشن میں آئے دیکھنے غنچہ دہن کی آنکھ　　اللہ کس غضب کی ہے اس گلبدن کی آنکھ

رکھ کے اکبر سامنے شمس و قمر کے آئینے　　اس کا جلوہ دیکھتے اس کا سراپا دیکھتے

اس کی روشن جبیں سے اے اکبر　　چاندنی چاند نے چرا لی ہے

حسن کے فیض سے دنیا کبھی خالی نہ رہی　　تو ہے موجود اگر یوسفِ کنعاں نہ رہا

☆

محولہ بالا اشعار سے محبوب کا جو سراپا اُبھرتا ہے، اس کی مزید صراحت کی ضرورت نہیں، چونکہ یہ ایک ایسا بے مثال غزالِ رنگین ادا ہے کہ شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ڈھونڈتا ہوں مثال میں اپنی
سامنے تیری بے مثالی ہے

اکبر جے پوری کی رومانی شاعری میں اس حسنِ بے مثال کی عشوہ طرازیاں بھی ہیں اور عشق کی وحشت خیزیاں بھی۔ یہاں محبوب کا ستم کارانہ انداز نہیں ملتا، بلکہ حسن بھی راہِ عشق میں دوش بدوش چلتا ہے۔

منزلِ عشق میں قدم بہ قدم
حسن بھی چل رہا ہے دوش بہ دوش

البتہ دنیائے عشق کے بعض سخت مراحل کو ذکر بھی اکبر کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔

موت ہے یا حیات کیا کہئے وہ محبت جو ناگہاں ہوجائے
نہیں رہتا ہے اک انداز دنیائے محبت کا کبھی برباد ہوتی ہے کبھی آباد ہوتی ہے
بے کیف سی دنیا ہے تو تاریک فضائیں یہ راہ محبت کی مجھے کس نے بتادی
آج کیا دنیا بدلتی ہے مریضِ عشق کی اضطرابِ صبح سے پیدا سکوتِ شام ہے
نگاہِ لطف اب فرمایئے اکبر کی جانب بھی دیارِ ہجر میں اب خاک بھی برباد ہوتی ہے

☆

شاہراہِ عشق میں درپیش ان حسی مراحل و کوائف کے ساتھ ساتھ اکبر کی شاعری میں وصلِ محبوب کی سرشاری، دلنوازی اور واردات و محسوسات کی ایک دنیا بھی آباد ہے۔ جس کے تخیلی و تجرباتی اظہار نے غزل کے بعض خوبصورت اشعار تخلیق کرادئے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے ؎

کیا فکر مجھ کو گردشِ لیل و نہار کی بیٹھا ہوں دل میں شوق کی دنیا لئے ہوئے
جب وہ تھا ساتھ دل میں اُترتی تھیں ٹھنڈکیں پر آج آگ کیوں ہے لگی ان گھٹاؤں میں
تم ہم سے جدا ہوکر یہ بات سمجھ لوگے تنہائی کے لمحے کیوں انسان کو ڈستے ہیں
تیرے قدموں کے تعلق سے بگڑنا بننا میری تقدیر ہے نقشِ کفِ پا کی صورت
قسم ترے شباب کی، قسم ترے جمال کی جواں جواں سی دلکشی تلاش کررہا ہوں میں
تم کو جو مست بنانا مجھے منظور نہیں میکدہ ساز نگاہوں سے پلاتی کیوں ہو
اکبر مری نظروں میں جلوؤں کی بہاریں تھیں آغوشِ محبت میں جب وہ مہِ کامل تھا

عالمِ انتظار میں کیفیتِ بہار ہے
مری نگاہِ شوق میں اس کی نگاہِ ناز میں

رفتہ رفتہ ان کی زلفیں ابر بن کر چھا گئیں
دھیرے دھیرے ان کا جلوہ زیرِ دام آ ہی گیا

☆

اکبر جے پوری کی رومانی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا معاشقہ اپنے محبوب کے فراقِ دوام پر منتج ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی عشقیہ شاعری میں جہاں وصالِ یار کی سرشاری اور سرمستی کے احساسات ملتے ہیں وہیں محبوب کے ہجر و فراق کے آتشیں جذبات سے لبریز متعدد اشعار بھی موجود ہیں، یہاں جذبات میں تجربے اور تخیل کی آمیزش سے عشق کے آفاقی و کائنات حسی پیکر وجود میں آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کے اشعار کچھ حد تک ہماری عشقیہ شاعری کا حصہ بننے کی صفت رکھتے ہیں۔

دیکھتے ہیں لوگ کیوں حسرت سے اب صورت مری
کیا سراپا بن گیا ہوں میں تری تصویر کا

سلامت باد اے داغِ محبت
کہ تو ہی شمع ہے اس خاکداں کی

مثلِ آئینہ میں تیری چشمِ قاتل میں رہا
مدتوں یہ تذکرہ اربابِ محفل میں رہا

میرا اکبر یہ دلِ پُر داغ بھی
اک شگفتہ پیار کا گلزار ہے

کردیا خاموش رازِ عشق نے
کہا کہے اکبر کسی دل کی بات

یاد آتی ہے کسی کی تو نکل جاتے ہیں اشک
کس طرح ہوتی ہے برسات تجھے کیا معلوم

آنکھوں سے جوئے خوں بھی رواں ہو تو کیا ہوا
دل میں کسی کا راز چھپائے ہوئے تو ہیں

میں رہا گل رخوں کی محفل میں
یاد آتا رہا ترا چہرہ

آنچ آئے نہ ان کے دامن پر — شعلۂ غم دکھا نہ اتنا جوش

سسکتا چھوڑ گئی تھی جسے نگاہ تری — وہ جی رہا ہے ابھی تک خدا کی قدرت ہے

پھر پارہ ہائے قلب وجگر چن رہا ہوں میں — پھر جمع کر رہا ہوں میں سامانِ اضطراب

عشق نے لا کے مجھے ایسی جگہ چھوڑا ہے — اب فنا کی کوئی صورت نہ بقا کی صورت

اے غمِ سوزِ عشق زندہ باد — زندگی چین سے بسر نہ ہوئی

حرف آجائے گا خدائی میں — شامِ غم کیا گر سحر نہ ہوئی

اے شورِ قیامت تو کیوں ان کو جگاتا ہے — سوئے تھے ابھی آکر، جاگے شبِ فرقت کے

☆

ان اشعار میں اگر چہ حزنیہ لے نمایاں ہے اور عشق کا سوز وگداز بھی موجود ہے، لیکن ان اشعار میں وہ تجرباتی وتخیلاتی فضا بھی اُبھرتی ہے جو دنیائے عشق کی المناک کیفیات کی آفاقی ترجمانی کرتی ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ ایسے اشعار کسی بھی زبان کی شاعری میں تادیر زندہ رہنے کی تب وتاب رکھتے ہیں۔ شیلی نے کہا تھا۔

"ہمارے سب سے مسرت زا اور طربناک نغمے وہی ہوتے ہیں جو اپنے دامن میں حسرت اور کرب کی سوغات لئے ہوتے ہیں"۔

اکبؔر جے پوری کی شاعری میں بھی ایسے متعدد اشعار موجود ہیں جو ان کی رومانی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور کشاکشِ حیات کے زائدہ بھی ہیں۔ اکبؔر کو دراصل "غمِ جاناں" بہت عزیز ہے کہ اس غم سے غمِ روزگار سے فرار بھی حاصل ہوتا ہے اور بہارِ حیاتِ رفتہ کی یادیں بھی تازہ ہوجاتی ہیں، رومانی شعرا کا یہ شیوۂ خاص رہا ہے کہ انہیں یادِ ماضی میں یک گونہ سکون وسرور حاصل ہوتا ہے۔ وہ دنیا

کی ہنگامہ آرائیوں سے پریشان ہوکر کبھی اپنے خوبصورت ماضی میں کھو جاتے ہیں، اور کبھی غمِ جاناں اور یادِ یار کے تذکرے چھیڑ کر دنیا کا غم غلط کرنے کا موقع تلاش کرتے ہیں۔ اکبر جے پوری کی شاعری میں بھی یہ رنگ نظر آتا ہے۔ وہ ''یادِ یار'' اور ''غمِ جاناں'' کو ہی زندگی گزارنے کا بہتر سہارا گردانتے ہیں، ذیل میں چند اشعار بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں جن سے اکبر کی رومانیت کے مذکورہ پہلو پر روشنی پڑ سکے گی۔

اے یادِ یار دے مجھے اب تو ہی آسرا
مجھ کو طلب نہیں ہے کسی غمگسار کی

مفقود ہو گئے غمِ جاناں کے تذکرے
ہر شخص رہ گیا غمِ دنیا لئے ہوئے

تیرا ہی نام ہے ابھی موضوعِ گفتگو
تیری طرف ہے شعر میں روئے سخن ابھی

خیالِ گردشِ ایام جب ستاتا ہے
میں چشمِ یار کے ساغر تلاش کرتا ہوں

دیدۂ تر سے ہے اے سوزِ دروں چشمِ امید
چھوڑنے کا نہیں اب دامنِ دریا میں بھی

اس چشمِ التفات پہ قرباں متاعِ دل
جس نے ہمارے درد کو درماں بنا دیا

کترا گئی ہے گردشِ دوراں کبھی کبھی
کام آ گیا ہے یوں غمِ جاناں کبھی کبھی

جو حاصلِ حیات ہے، جو دل کا کائنات ہے
ہجومِ غم میں وہ خوشی تلاش کر رہا ہوں میں

آہنگِ غم کی آج بھی ہے انفرادیت
گم ہے جہاں کا شور ہماری صداؤں میں

☆

اکبر جے پوری کی غزل کا اسلوب سادہ براہِ راست مگر پُرکار ہے، انہوں نے کلاسکی علامات، استعارات اور تلازماتِ سخن سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے، ساتھ ہی حسبِ ضرورت نئے ڈکشن اور نئے استعارات بھی استعمال کئے ہیں۔

اکبر کی غزل میں تغزل کا رنگ نمایاں ہے، وہ اپنے داخلی جذبات، احساسات اور تجربات کو شعری رنگ و آہنگ عطا کرنے کا ہُنر جانتے ہیں۔ اکبر کی شعری زبان پر فارسیت کا اثر بھی موجود ہے لیکن اس سے ان کے یہاں مشکل پسندی کا شائبہ پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اسلوب میں صلابت اور متانت در آئی ہے۔ اکبر کی شاعری فطری اور تجرباتی شاعری ہے، اس لئے اس میں فکر و جذبے کی سطح پر تکلف و تصنع کاری ناپید ہے۔ اکبر کی شاعری ایک اعتبار سے ان کی زندگی کے نشیب و فراز، سرد و گرم، رنج و راحت اور کیف و کرب کی سرگزشت ہے، لیکن اس میں اجتماعی احساسات و تجربات کا عکس و نقش بھی ہویدا ہے۔ ان کی غزل کے بیشتر اشعار میں سوز و گداز، درد و تاثیر اور لطافت و اشارت موجود ہے، لہٰذا ان میں اجتماعی حافظے کا حصہ بننے کی صفت پیدا ہوگئی ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کی شعری ''داخلیت'' میں اگر اجتماعی احساس کا تخلیقی جوہر نمو کر جائے تو یہ شاعر اور اس کی شاعری دونوں کے حق میں نیک شگون ہوتا ہے۔ اکبر جے پوری کی شاعری میں بھی ایک حد تک یہ خصوصیت موجود ہے۔

اکبر صاحب بھرپور شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ چنانچہ ان کی شاعری کا مطالعہ سنجیدگی کے ساتھ کا ی جانا چاہیے اور کشمیر کی ادبی تاریخ میں انہیں مناسب مقام بھی ملنا چاہئے۔ میرے خیال سے کسی تخلیق کار کا کسی بھی زبان میں دادِ سخن دینا بھی ایک ادبی خدمت ہے، لیکن اس زبان کو زندہ رکھنا اور اس کی بقا کیلئے جدوجہد کرتے رہنا اس سے بھی بڑی خدمت ہے، چنانچہ یہ بات یقین

کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اکبر جے پوری نے اردو کیلئے بیک وقت دونوں خدمات انجام دی ہیں، اس لئے ان کی خدماتِ زبان وادب کا اعتراف کرنا ادبی دیانتداری کا تقاضا ہے۔

یہ کم نہیں کہ حقیقت کے اُٹھ گئے پردے
مری نظر کو جو کرنا تھا کام کرآئی

حوالے:

(۱) اکبر جے پوری بحوالہ ''شانِ ہند'' (ماہنامہ) ص۲۵، مدیر سرور تونسوی، دسمبر ۱۹۵۵ء دہلی۔

(۲) بحوالہ ''شانِ ہند'' ص ۲۷، دسمبر ۱۹۵۵ء دہلی

(۳) بحوالہ فکروخیال، ص ۶، ازاکبر جے پوری ۱۹۸۷ء

(۴) بحوالہ ''نیا دور'' ص ۲۱۔ بابت دسمبر ۱۹۹۸ء (لکھنو)

(۵) سازِ شکستہ ص ۱۱۶ ازاکبر جے پوری مطبوعہ ۱۹۶۶ء

(۶) سازِ شکستہ ص ۱۵ تا ۱۶

(۷) سازِ شکستہ ص ۱۳

(۸) بحوالہ ''شانِ ہند'' ص ۲۵، بابت دسمبر ۱۹۵۵ء، دہلی۔

(۹) بحوالہ، سازِ شکستہ ص ۱۱

(۱۰) چمن زار ص ۹ ازاکبر جے پوری مطبوعہ ۱۹۹۸ء

☆☆☆

اکبر جے پوری

(سرور تونسوی)

ایڈیٹر ماہنامہ شانِ ہند دہلی دسمبر 1959ء

امیرِ کبیر میر سید علی ہمدانیؒ تقریباً چھ سو سال قبل کشمیر آئے۔ اُن کے بھتیجے اور داماد میر سید محمد ہمدانیؒ کی نسل کشمیر میں ہمدانی سادات کے نام سے مشہور ہے۔ یہ خاندان ہمیشہ سے علوم و فنون اور شرافت و بزرگی کے لحاظ سے قابلِ احترام رہا ہے۔ حضرت شاہِ ہمدانؒ بہت بڑے عالم، مبلغ دین، شاعر اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ علم و حکمت اِس خاندان کا ورثہ ہے۔ چنانچہ میر سید زمان شاہ آج سے نصف صدی پہلے محلّہ حسن آباد سری نگر میں مقیم تھے۔ بہت بڑے عالم اور شہر کے معزز ترین اصحاب میں شمار کئے جاتے تھے۔

مہاراجہ پرتاب سنگھ جی کے دربار میں ان کی عزت تھی اور مہاراجہ نے اُن کو اعزازی جاگیر بھی عطا فرمائی۔ میر زمان شاہ کے پوتے میر سید علی اپنے بھائی میر سید محمد کے ہمراہ تلاش معاش میں ۱۹۲۰ء میں یو پی کی طرف روانہ ہوئے۔ علوم عربی و فارسی میں فارغ التحصیل تھے۔ مدرسہ الواعظین لکھنو میں بھی کچھ عرصہ

رہے۔ برطانوی حکومت میں کنٹریکٹر ہوگئے۔ خدا کی دین کہ چند سالوں میں لاکھوں روپے کا منافع ہوا۔ آپ موسم سرما میں آن جہانی مہاراجہ مادھو سنگھ جی کے ایماء پر جے پور میں رہتے اور موسم گرما میں شملہ، نینی تال یا اپنے آبائی وطن کشمیر آتے۔

جے پور کے حسین شہر میں ۱۹۲۸ء میں اُن کے گھر ایک فرزند پیدا ہوئے جن کا نام اکبر رکھا گیا۔ اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ مسلم مڈل اسکول جے پور میں داخل ہوئے تو مڈل کا امتحان تمام بورڈ میں اول آکر پاس کیا۔ دربار ہائی سکول جے پور سے میٹرک کا امتحان نہایت اعزاز سے پاس کر کے مہاراجہ کالج جے پور میں کالج کے ذہین اور ہونہار طلباء میں شمار ہونے لگا۔ ہائی اسکول سے مدرسہ کی محفل مباحثہ میں حصہ لینے کے علاوہ اسکول میگزین کی ایڈیٹری کا کام خوش اسلوبی سے انجام دینے کے باعث ایک میڈل پایا۔ کالج میگزین کی ایڈیٹری بھی اکبؔر نے سنبھالی اور یہاں آکر ادبی ذوق اور نکھر گیا۔ پروفیسر طاہر نقوی کی سرپرستی میں ''بزمِ اردو'' قائم کی اور ادبی محفلوں اور مشاعروں کا اہتمام کرتے رہے۔ اکبؔر کالج کے سب سے کم سِن طالبِ علم تھے۔

بدقسمتی سے ۱۹۴۳ء میں اکبؔر کے والد صاحب کو ایک نہر کے ٹھیکے میں پانچ لاکھ روپے کا خسارہ ہوا اور پھر وہ سنبھل نہ سکے۔ اکبؔر کی کالج کی زندگی پر بھی اُس کا اثر ہوا۔ اور وہ حالاتِ زمانہ سے مجبور ۱۹۴۴ء میں اپنی والدہ کی معیّت میں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو لیکر اپنے آبائی وطن کشمیر چلے آئے۔ یہاں آکر پنجاب

یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات میں ریاست بھر میں اول آئے پھر انگریزی میں بی اے کے بعد تدریسی کی تربیت حاصل کی اور آج کل سرینگر کے ٹیچرز ٹرینگ انسٹیچوٹ میں اردو پڑھاتے ہیں۔

اکبرؔ نے تیرہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔ بچپن سے شوخ تبع بے باک اور حاضر جواب تھے ایک مشاعرے میں حضرت اطہرؔ ہاپڑی نے جو ننھے سے شاعر کو دیکھا تو اپنے گھر بلایا۔ ناظم الملک امام فن سید معشوق حسین اطہرؔ علی اللہ مقامۂ (جن کا فروری ۱۹۵۸ء میں کراچی میں انتقال ہوا) ان کے ہمسایہ تھے۔ اکبرؔ نے اُن سے علم عروض و قافیہ سیکھا۔ مولانا روزانہ ایک مصرع دیا کرتے اور اکبر تیس چالیس اشعار کی غزل لکھ کر لاتے۔ اصلاح کی وجہ پوچھتے زود گوئی اور فی البدیہہ کہنے کا ملکہ بچپن سے تھا۔

پھولوں کا دِل لگا ہے عروسِ بہار سے

اکبرؔ نے غزل اصلاح کیلئے استاد کی خدمت میں پیش کی۔ مطلع کیلئے متعدد اشعار موزون کئے تھے۔ ایک شعر دیکھ کر حضرت اطہرؔ نے اپنا دیوان نکال کر اس زمین میں لکھی ہوئی غزلوں میں سے ایک شعر قلم زد کرتے ہوئے فرمایا کہ ''آج نوجوان شاگرد اپنے بوڑھے اُستاد سے بازی لے گیا''۔

آنسو نہیں گرے مژۂ اشکبار سے
موتے چھنے ہیں دامنِ ابرِ بہار سے

اس غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

مشکل ہے ان کا حشر میں اُٹھنا مزار سے　　عاشق جو گر گئے نگہہَ نازِ یار سے

موسیٰ کو کوہِ طور پر غش آ گیا سہی　　اپنی تو آنکھ جھپکی نہ دیدار یار سے

جیسے ہلالِ عید سے خوش روز دار ہوں　　یوں خوش ہیں رِند آمدِ ابرِ بہار سے

کرنا نہ تھا رقیب کا تجھسے مجھے گلہ　　ہوں مشتعل تری نگہہ شرمسار سے

واعظ ڈرینگے پرششِ روز جزا سے وہ　　مایوس ہیں جو رحمتِ پروردِگار سے

کشمیر آ کر اکبر نے اپنے وطن مالوف کی یاد میں نالہ فراق لکھا جس کا مطلع ہے ؎......

آہ جے پور رشکِ فردس بریں　　یاد ہے جب تھا میں بھی تجھ میں مکین

حضرت مولانا اطہر نے تحریری اصلاح کو مناسب نہ سمجھا اور اکبر کو جے پور واپس بلایا لیکن یہ نہ جا سکے اور سلسلہٗ تلمند منقطع ہو گیا۔ استاد کو اپنے ہونہار شاگرد سے کافی محبت تھی چنانچہ ایک منظوم خط کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

میں یہاں جے پور میں ہوں تم وہاں کشمیر میں
یہ جدائی بھی لکھی تھی آہ مری تقدیر میں

تیر ہرگز پہلوئے کمان میں رُکتا نہیں
دوستی نبھتی نہیں اکثر جوان و پیر میں

بھول جاتا ہوں خدا کو یاد پھر آتا ہے وہ
نام جب اُس کا کبھی آ جاتا ہے تکبیر میں

خلیفہ عبدالحکیم یہاں ناظمِ تعلیمات اور کالج کے پرنسپل تھے اُن کی وساطت

سے حضرت حفیظؔ جالندھری تک رسائی ہوئی حفیظؔ نے اکبرؔ کی غزلوں اور نظموں کو بنظرِ استحسان دیکھا اور ہمت افزائی فرمائی۔

کشمیر میں نو آمد کے تھوڑے دنوں بعد ہی سر رضا علی خان کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اکبرؔ سب سے کم سن شاعر تھے جن کے کلام کو بے حد سراہا گیا۔ آزاد کشمیر کے حالیہ صدر خورشید حسن صاحب کے والد مولوی محمد احسن سرینگر میں مدارِس کے ناظر تھے ایک محفل میں جہاں وہ اساتذہ سے غیر رسمی بات چیت کر رہے تھے انہوں نے سُنا کہ اکبرؔ شاعری کا ذوق بھی رکھتے ہیں تو انہوں نے اکبرؔ کو کچھ سنانے پر مجبور کیا۔ اکبرؔ نے غزل سُنائی ۔

اب آرزوئے گیسوئے خمسدار کیا کریں
دِل کو مصیبتوں میں گرفتار کیا کریں
دل ہی نہ ہو تو عشق کے ارمان سب فضول
یوسفؑ نہ ہو تو مصر کا بازار کیا کریں

مرحوم احسنؔ صاحب نے فی البدیہہ اِسی زمین میں چند شعر سنا کر مقطع میں اس طرف اشارہ فرمایا ۔

اکبرؔ ہوا ہے بزم میں اپنی غزل سراء
بوڑھے سوائے شوخیِ گفتار کیا کریں

اکبرؔ کی شاعری میں جذبات کا اُبھار ہے، جوش ہے، روانی ہے شیرینی ہے۔ اکبرؔ نے وطنی شاعری بھی کی ہیں، سماجی اور جذباتی بھی۔ مسلسل نظمیں بھی لکھی ہیں اور

غزلیں بھی لیکن غزل کے میدان میں جہاں اُن کے جذبات کا بہاؤ حسین و نازک رَو میں جولانیاں دِکھاتا ہے۔ اکبر کی شاعری کا کمال اور عروج ہے اُنکی شاعری میں انفرادیت ہے۔ جس کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

غیر کے نقشِ قدم کو کیا دیکھیں
راہ اپنی ہی راہ ہوتی ہے

گوشہ نشینی اور تنہائی اُن کا خاصہ ہے ؎

اکبر گوشہ نشین سے کوئی واقف کیا ہوا
کہ یہ تو نام و نشان کا کبھی خواہاں نہ ہوا

اُن کے کلام کو پسند عام کی سند نہ مِل سکی تو اس پر بد دِل نہ ہوئے ؎

گروہ خاص سمجھتا ہے حرزِ جان اس کو
مرا کلام گرچہ پسند عام نہیں

حسن آباد سرینگر میں اکبر کی کوششوں سے ایک اورینٹل کالج کی بنیاد ڈالی گئی جس میں پنجاب یونیورسٹی کے اردو کے امتحانات کی تعلیم کا اہتمام تھا۔ یہ ادارہ چار سال تک زبان و ادب کی خدمت انجام دیتا رہا۔ اس کالج کے الحاق کی بات پنجاب یونیورسٹی سے ختم ہوئی تو ۱۹۵۳ء میں جامعہ اردو علی گڈھ کے امتحانات کی تعلیم کا مرکز کھولا گیا۔

۱۹۴۷ء میں کل ہند انجمن ترقی اردو کی ریاستی شاخ قائم کی اور تب سے انجمن کے سیکریٹری کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے آئین میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن اردو یہاں کے عوام کی زبان نہیں۔ اردو کو عوام میں مقبول بنانے اور اردو کے چلن کو بڑھاوا دینے اردو زبان کی تعلیم کے متعلق حکومت سے مطالبے منوانے میں اکبؔر کا بڑا ہاتھ ہے۔ انجمن ترقی اردو کے تحت سال میں چار پانچ بڑے عظیم الشان جلسے اور مشاعروں کا اہتمام ہوتا رہا ہے۔ ''یوم اقبالؔ'' ''یومِ غالبؔ'' طرحی اور موضوعی مشاعرے بڑی دھوم سے منعقد کئے جاتے ہیں اور اکبؔر اپنے گاڑھے پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو ایسی ادبی تقریبوں پر خوشی سے نثار کرتے آئے ہیں۔

کُل ہند اردو کانفرنسوں میں اکبؔر جے پوری اپنے ساتھیوں سمیت دہلی اور علی گڈھ جاکر اپنی ریاست کی نمایندگی کرتے آئے ہیں۔ انجمن کے اجلاس کی کاروائیوں کو طبع کرا کے مفت تقسیم کرتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے تحت سولہ کتابچوں کو شائع کرایا۔ انجمن کے وقار اور ہردلعزیزی میں اکبؔر کی مالی اور جانی قربانیوں کے علاوہ اُن کے انہماک اور جوشِ عمل کا دخل ہے۔

ہائی اسکولوں کیلئے اردو قواعد و مضامین کی ایک مبسوط کتاب ''رہنمائے اردو'' تالیف کی جو ہزاروں کی تعداد میں چھپی اور بہت مقبول ہوئی ''اخبار اسادات'' ''شمع حرم'' اور ''شاعرات اور اقبال'' کو شائع کرایا۔ کشمیر کے پنڈت شعراء اردو کا مبسوط تذکرہ ترتیب دے رہے ہیں ''تاریخ حسن آباد'' کے نام سے زیرِ طبع ہے جس میں جہانگیر کے زمانہ سے علمی اور ادبی پس منظر کو پیش کیا ہے۔

اکبؔر جے پوری کے مقالے' افسانے' نظمیں' غزلیں ریاست کے ادبی

رسائل اور اخبارات کے علاوہ ہندوستان کے مختلف اخبارات اور جرائد میں شائع ہوکر ادبی دنیا میں پسند کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن اکبر کی لااُبالی طبیعت پریشان حالی اور پراگندہ خیالی نے جم کر اکبرؔ کو کسی ایک طرف توجہ دینے کے لائق نہ رکھا کشمیری شعراء میں سے حضرت مہجورؔ اور رسولؔ میر سے بہت متاثر ہیں۔ چنانچہ مہجورؔ کی شان میں ایک بلند پایہ نظم ''تعمیر'' میں شائع ہو چکی ہے۔

دسمبر ۱۹۵۷ء میں اکبرؔ کے گھر چوری ہوگئی اور چور نہ صرف زر وزیورات کپڑے برتن لے گئے بلکہ تمام ضروری کاغذات اور تحریرات بھی۔ جن میں نہایت قیمتی اور نایاب مسودے اور اکبرؔ جے پوری کے مطبوعہ کلام' مقالوں اور افسانوں کے مجموعے کو بھی چور لے گئے جو تراشوں کو جمع کر کے محفوظ کیا گیا تھا۔ آج اکبرؔ جے پوری کے ذہن و حافظ میں کچھ موجود ہو تو ہو ورنہ ان کے کلام کا کہیں نشان موجود نہیں۔

زمانہ کی ناقدر شناسی' حادثات عالم اور نامناسب ماحول اکبرؔ کے مجروح دِل کو افسردہ اور پژمردہ بنا دیا ہے۔ قلیل تنخواہ پر ایک بڑے کنبہ کا بار ہے۔ زمانے کی بے وفائی اور ابنائے زمانہ کی غرض مندانہ دوستی نے دِل وجگر زخمی کر دیا ہے ؎

ہے پرانے دشمنوں کی دشمنی سے بھی سخت تر
آج کل کے دوستوں کی دوستی میرے لئے

زندگی کے ابتدائی دور میں جو آرام و آسائش میسر تھی اس کے بعد یہ دورِ افلاس و احتیاج اکبرؔ کیلئے بے حد پریشان کن ہے حضرت سعدیؔ فرما گئے ہیں ؎

سخت است پس از جاہ تحکم بُردن
خو کردہ بہ ناز، جور مردم بُردن

اس لئے گُلشن کی رنگینیاں اکبرؔ کا دِل نہ بہلا سکیں ۔

اکبر اگر چہ خُلد ہے کشمیر کا چمن
جے پور کی جو یاد ستائے تو کیا کروں

خالدِ کشمیر بخشی غلام محمد کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ریاست کی ادبی اور ثقافتی احیاء کیلئے مُلک بھر میں شاعروں اور فنکاروں نے انگڑائی لی۔ اُن کے ادب نوازی سے نہ صرف موجودہ شعراء بلکہ مرحوم شعراء اردو و کشمیری بھی مستفید ہوئے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں خالدِ کشمیری نے اپنی کوٹھی پر ریاست کے تمام پختہ کلام اور نو خیز شاعروں اور ادیبوں کو مدعو کیا۔ علامہ فیضیؔ صاحب نے کلچرل فورم کی افتتاحی تقریر کی اور پھر ایک مختصر سا مشاعرہ بھی شروع ہوا۔ سب شعراء اپنا کلام ساتھ لائے تھے۔ اکبرؔ جے پوری اس بات سے واقف نہ تھے کہ وہاں مشاعرہ بھی ہوگا اسٹیج پر آئے تو فی البدیہہ ایک نظم مناسبِ حال پیش کی ۔

اُٹھیں پھر محفلِ گُل میں آرزوں کو جواں کر دیں
چلیں پھر بلبلوں کو آشنائے گلستاں کر دیں
شگوفے اب تو شعر و شاعری کے کھلنے والے ہیں
ہوائے ذوق سے بیدار روحِ گُلستاں کر دیں
چھپے ہیں اِس وطن کی خاک میں گمنام سے موتی
ستاروں کی طرح اِن موتیوں کو ضوفشاں کر دیں

مِلا ہم کو مقدر سے جو ایسا کارواں سالار
روانہ سوئے منزل کیوں نہ ہم بھی کارواں کردیں
پھلیں پھولیں رہیں قائم ہمارے خالدِ کشمیر
انہی کی رہبری میں اِس زمیں کو آسماں کردے

سرینگر کی نمائش گاہ میں ایک آل انڈیا مشاعرے میں مرحوم ہری چند اخترؔ صدارت فرما رہے تھے۔ شمیم کرہانی کے بعد اکبرؔ کا نام آیا تو میرِ مشاعرہ نے اعلان فرمایا:

''یہاں ہر صوبے اور ریاست کے شعراء مدعو ہیں۔ اب راجستھان کے ایک نوجوان شاعر اکبر جے پوری اپنا کلام سُنائیں گے''۔

اکبرؔ کا نام پکارا تو حُسنِ اتفاق سے اُسی وقت جناب بخشی صاحب محفل میں داخل ہو رہے تھے۔ حاضرین تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ اکبرؔ جے پوری کا نام سُنتے ہی وہاں سے فرمایا ''یہ ہمارے ہیں...... کشمیری ہیں...... راجستھانی نہیں'' اکبر جے پوری اِس جُملے سے متاثر ہوئے اور فی البدیہہ ایک قطع سُنایا اور اِس کے بعد اپنی غزل ۔

آگیا محفل میں اپنی صاحبِ ذوقِ سلیم
رونق بزمِ ادب حاکم والا تبار
وہ کہ جس نے آبرو رکھ لی وطن کے آن کی
وہ کہ جس پر اُٹھتی ہے عالم کی چشمِ اعتبار

خالدِ کشمیر بخشی صاحبِ جودو سخا

ڈوبتی نبضوں میں جس نے بھر دیا خونِ شرار

ہے دعا اکبرؔ کی یہ روز وشب و صبح و شام

سایۂ رحمت ہو تجھ پر اے دلوں کے تاجدار

اِن واقعات نے اکبرؔ کی بدیہہ گوئی کا سکّہ جناب خالدِ کشمیر کے دِل پر بٹھا دیا۔ چنانچہ ''جشنِ بہاراں'' کے موقع پر جب ہندوستان کے بلند پایہ شعراء کرام خصوصی دعوت پر بلائے گئے تھے۔ اکبرؔ جے پوری نے ایک غزل پیش کی ؎

زخموں سے دِل کو تم نے گلستان بنا دیا

ہر اشکِ غم کو شمعِ فروزاں بنا دیا

خوں گُشتہ دِل کو رشکِ گلستان بنا دیا

سوزش سے آنسوؤں کو چراغاں بنا دیا

اللہ رے تیرے راز کی یہ پردہ داریاں

ماضی کے ہر خیال کو نسیاں بنا دیا

دے دے کے داغ تیری جدائی نے بارہا

زخمِ جگر کو اور نمایاں بنا دیا

کیوں کر نبھے گی اس دلِ کُفر آشنا سے اب

مُجھ کو تو اِن بُتوں نے مسلماں بنا دیا

دستِ جنونِ شوق کی ہائے رے بے بسی

چاکِ جگر کو جزوِ گریباں بنا دیا

چاروں طرف ہے حسن کی یہ جلوہٗ ریزیاں

بیداریوں کو خوابِ پریشاں بنا دیا

لایا تھا داغ دِل کے نمائش کے واسطے

اُن کو چراغِ ''جشنِ بہاراں'' بنا دیا

تمام ارکانِ کابینہ معززینِ شہر کے جمِ غفیر میں بخشی صاحب بھی موجود تھے۔ شعراء کرام کے کلام کو سُنتے جاتے اور مناسب داد دے کر حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ آخری شعر پہ غالباً اُنہوں نے ہی یہ فقرہ کسا ''آپ کو غلطی ہوئی یہ نمائش گاہ نہیں محفلِ مشاعرہ ہے''۔ اکبر جے پوری نے فوراً جواب عرض کیا:۔

شاعر تو میں نہیں ہوں مگر خالدِ کشمیر

تیری عنایتوں نے غزل خواں بنا دیا

پھر اِسی قافیہ کو ذرا مقطع میں اِس طرح باندھا ہے:۔

اکبر سے دِل گرفتہ و مجبورِ ستم کو

ایسی نمائشوں نے غزل خواں بنا دیا

اکبر جے پوری کو اپنی کم مائیگی کا احساس تو ہے لیکن احساسِ کمتری نہیں۔۔

بُرا ہوں میں لاکھوں سے اکبر تو کیا

ہزاروں سے لاریب اچھا ہوں میں

کشمیر کے ذریں ماضی میں شاعر تو ہزاروں گزرے ہیں۔

احباب کی رنگیں محفل میں اکبر سا غزل خواں آج بھی ہے۔ایسی ہلکی پھلکی شاعری اکبر کی حاضر جوابی اور ذکاوتِ طبع کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہے۔اکبر نے بہت سے معززین کی تاریخِ وفات بھی نہایت خوبی سے نظم کی ہے۔

کشمیر کے قومی تہوار ''یومِ شہدا' پر جو 13 جولائی کو ہر سال بڑی شان سے منایا جاتا ہے اچھی نظمیں لکھی ہیں۔نمونہ کے طور پر ذیل کے چند اشعار پیش ہیں۔

تجدید عہد

اے زمین کاشمیر اے وادی جنت نشاں
تیری رونق دیکھ کر چکرا رہا ہے آسماں
تیرا ماضی باعثِ صد ناز ہے میرے وطن
تیرا گلشن بے خزاں تھا پُر فضا تیرا چمن
تو رہا زیرِ نگیں 'اغیار کا' صدیوں تلک
تیری محکومی پہ تھی شبنم فشاں چشمِ فلک
وادی راحت فزا جب غیر کی محکوم تھی
جبر واستبداد سے تیری فضا مسموم تھی
باغ جنت گو ترا محکومیت بر دوش تھا
نغمہ زن تیری رگوں میں حریت کا جوش تھا
خوبیِ قسمت سے تیری مل گئے اب باغبان
رشکِ صد جنت ہوا پھر سے تیرا یہ گلستان

حریت کا تیرے افسانوں میں ہے پنہاں سبق
انقلاب دہر تیری داستاں کا ہر ورق
کوشش و ایثار پیہم کا ہے تو آئینہ دار
تیرا ہر ذرّہ ہے دنیائے شجاعت در کنار

دوسری نظم کے چند شعر سُنیئے ۔

شہیدانِ وطن کی یاد میں

سینچا ہے اپنے خون سے گُلستانِ کشمیر — لاکھوں سلام تُم پہ شہیدانِ کاشمیر
ہاں ہاں یہی تو ہیں وہ شہیدانِ کاشمیر — آباد جن کے دم سے تھا زندانِ کاشمیر
بکھرے ہوئے یہ ٹکڑے شہیدوں کے تن کے ہیں — یا بھر گیا ہے پھولوں سے دامانِ کاشمیر
رنگینی وطن کی یہ وسعت تو دیکھئے — ہر قطرۂ لہو میں ہے بُستانِ کاشمیر
ہر برگِ گُل مرقع قوسِ قزح ہے آج — نکھرا ہے رنگِ خون جوانانِ کاشمیر
شمع وطن پہ ہنستے ہوئے ہوگئے نثار — پروانہ ہائے شمعِ شبستانِ کاشمیر
ہر سمت ظلم وجور کی چلتی تھی گولیاں — تھا قبضۂ خزاں میں گلستانِ کاشمیر
پھیلا وہ نور مٹ گئی سب ظلمتِ وطن — اے زندہ باد مہرِ درخشانِ کاشمیر
اِس سُرخ پوش پرچمِ قومی کے میں نثار — ہے یادگارِ خونِ شہیدانِ کاشمیر

☆

بادِ گلفام سے لبریز ہے تیرا سُبو — تیری پیشانی پہ رقصاں ہے شہیدوں کا لہو
کاروانِ سعی کی حسیں منزل ہے تو — اے گلستانِ وطن ایثار کا حاصِل ہے تو

تیرے سر پر دیکھ کر تاجِ حُریت جلوہ گر　　آستان پہ تیرے جھکتے ہیں جانبازوں کے سر

تیرا گلشن ہے شہیدوں کے لہو سے لالہ خیز　　راہ گم کردہ ہیں تیرے آستاں پہ سجدہ ریز

ان شہیدانِ وطن کے خون کی ہم کو قسم　　سرنگوں ہونے نہ دینگے ہم کبھی تیرا علم

کشمیر میں اکثر سیلاب آتے رہتے تھے۔ جولائی ۱۹۵۹ء کا سیلان ایک خطرناک سیلاب تھا جس نے سارے مُلک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لہلہاتے کھیت انسانی لاشوں، مکانوں اور جانوروں سمیت پانی بہا کر لے گیا۔ ایک سچّے محبّ وطن اور انسان دوست شاعر کی حیثیت سے حالیہ سیلان کی تباہ کاریوں پر بھی لکھا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

خونابہ ریز کیوں ہے مری چشمِ تر نہ پوچھ
وجہ شکستگی کا دِل نوحہ گر نہ پوچھ
پنہاں مری خموشی میں ہے غم کی داستاں
جسکو بیاں میں کر نہ سکوں وہ خبر نہ پوچھ
محصور ہو کے رہ گئے، گرداب آب میں
ڈوبے ہوئے اُبھر نہ سکے عمر بھر نہ پوچھ
پامالِ آب ہو گئیں شاداب کھیتیاں
برباد کس طرح ہوئے آباد گھر نہ پوچھ
دہقان کی امیدوں پہ پانی جو پھر گیا
خوشحالی وطن بنی مُفلِس کا گھر نہ پوچھ

طوفانِ نوح بن گیا جہلم کا پیچ و تاب
جس سے زمانہ ہوگیا زیر و زبور نہ پوچھ
کتنے غریب دب کے مرے کتنے ڈوب کر
کتنے مکاں آ کر گرے خاک پر نہ پوچھ
کیسی پڑی ہے اوس زِ کشتِ امید پر
اشجار کتنے بہہ گئے کتنے ثمر نہ پوچھ
بھاگے ہیں چھوڑ چھوڑ کے گھر بار جو غریب
گھبرا کے کون کون گرے خاک پر نہ پوچھ
نورِ وطن کو آہ یہ کیسا گہن لگا
کیا کیا گرے ہیں ٹوٹ کے شمس و قمر نہ پوچھ
ڈوبا جو دِل تو ڈوب گئیں سب امنگیں بھی
سیلاب کا یہ عالم زیر و زبر نہ پوچھ
اکبر غریب بیٹھا ہوا دیکھتا رہا
آنکھوں کے سامنے گرے دیوار و در نہ پوچھ

اکبر کی جذباتی اور رومانی شاعری میں ایک خاص رنگ ہے۔ وہ محبت کا بندہ ہے۔ ایک بے باک اور بے لاگ محبت جس میں تپش ہے تڑپ ہے اور معصومیت بھی۔ کہیں کہیں اس طرح اشارہ کیا ہے۔ ؎

بے باک تمناؤں کی تقدیس کی قسم
وہ بارگاہِ ناز سجائے ہوئے تو ہیں

بے درد زمانے کی نگاہوں سے چھپا کر
بے داغ جوانی کی وفا یاد رہے گی
اِظہارِ محبت کی ادا یاد رہے گی
ہر بات تری جانِ وفا یاد رہے گی
وہ دِن وہ چمن زار، وہ مخمور فضائیں
وہ جھوم کے چلنے کی ادا یاد رہے گی
بے وجہ چشم ناز میں اشکوں کے شرارے
معصوم نگاہوں کی جفا یاد رہے گی
وہ روٹھنا منہ پھیر کے بے وجہ تمہارا
ناکردہ گُناہوں کی جفا یاد رہے گی
اُمڑے ہوئے طوفانِ محبت کے مقابل
وہ چاند پہ بدلی کی گھٹا یاد رہے گی
جِھلمل سی میری شمعِ امید بُجھائے
اتنی سی جو اِک تُند ہوا یار رہے گی
جِس سے دِلِ افلاک میں پیدا ہو تلاطم
مظلوم دلوں کی وہ صدا یاد رہے گی

ایک بہت طویل نظم ''پھر آ گئے'' کے چند اشعار:۔

مجروح دِل میں تیر چُبھانے پھر آ گئے　　آنکھوں سے میری خون رُلانے پھر آ گئے
بھر پور جوانی کا جھلتا ہوا جوبن　　وہ امتحانِ صبر دِلانے پھر آ گئے

اُلفت بھری نگاہ میں شرم و حیا کا رنگ — وہ رازِ دِل کو مجھ سے چھپانے پھر آ گئے

پہلے تو کر گئے تھے مجھے وقفِ انتظار — مفہومِ انتظار بتانے پھر آ گئے

اب ہے جدھر نگاہ اُدھر جلوہ گاہ ہے — وہ کائنات شوق چھپانے پھر آ گئے

ہے داغ جوانی کے مچلتے ہوئے ارمان — ارمانوں کی دُنیا کو جگمگانے پھر آ گئے

جذبات کے اُمڑے ہوئے سیلاب کی رو میں — بے باک جوانی کو بہانے پھر آ گئے

مایوسیوں کی رات میں چمکانے چاند کو — وہ شمعِ اُمید جلانے پھر آ گئے

اُجڑا ہوا تھا یاس سے گلشن حیات کا — افسردہ دل کے پھول کھلانے پھر آ گئے

☆☆☆

عکسِ بادل

اس عطرِ گُلاب کی مہک کا احساس پورے تیس برس گذرنے کے باوجود اب
تک میرے دِل و دماغ میں موجود ہے۔ جو جناب اکبر جے پوری صاحب قبلہ
نے رسمِ رخصتی کی شام کو میرے شادی کے کپڑوں پر چھڑک دیا اور اسی نکہت
بکھیرتے ہوئے سپردۂ احساس کے تار پود میں جکڑ کر میں اُن کے خاندان سے
وابسطہ ہوگیا...... وابسطہ کیا ہوگیا کہ محبت اور شفقت کی نازک اور قیمتی زنجیروں
میں بندھ کر ان ہی کا ہو کے رہ گیا۔ اور ہر لمحہ میرے ذہنِ ناپختہ پر اُن کے خلوص
اور حیاداری کی پُروائیاں چلتی محسوس ہوتی تھیں...... جن کے اثر سے میں بے قرار
ہو کر تمام رسم ورواج کو روندھ کر کسی بھی وقت اُن کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا
کرتا تھا اور جناب اکبر جے پوری صاحب کے عادات و گفتار حتی الوسعیٰ حِظ اُٹھا کر
اپنے دِل و دماغ کے پیاسے چمن کو سیراب کر کے واپس چلا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اُن
کی منفرد مزاجی اور کردار کی عظمت کا میں نہ صرف قائل ہوا بلکہ فریفتہ ہونے کی حد
تک اُن سے قریب تر ہوتا گیا یہاں تک کہ کبھی کبھی اُن کے سامنے ایک طالبِ
علم کے روپ میں زانوئے ادب تہہ کرتا تھا۔

قبلہ جے پوری صاحب پورے ہندوستان کے ادبی اور علمی حلقوں میں ایک قدآور فرد کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ لیکن ان کے علمی اور ادبی بہاریں ہی ریاستی حکومت کے عتاب نے اُن کی خودداری اور مطمین نفسی کو للکارا اور انہیں جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر کے انہیں ان کی نازک اور حسین دنیا سے الگ کر دیا۔ لیکن وہاں بھی اُن کا قلم چلتا رہا۔ صیاد تو بُلبل کو صرف پنجرے میں قید کر سکتا ہے لیکن اُس کے دِل کے ساتھ گلستان کی حسین اور خوبصورت تصوراتی دھاگے ظلم کی تلوار سے نہیں کاٹ سکتا۔ اور بلبل پنجرے میں زیادہ سے زیادہ راہ چلتے مسافروں کو اپنی دُکھ بھری آواز سے متوجہ کر سکتا ہے۔ جس کی مثال جے پوری صاحب کی جیل میں لکھی ہوئی نظم ''زندان کا شبِ مہتاب'' ہے۔ جناب جے پوری صاحب کو اللہ نے ایک شاعر کا دل دے کر اپنا اور اپنی قدرت کا دیوانہ بنایا تھا۔ اسی لئے وہ ہر لمحہ یا محوِ عبادت نظر آتے تھے یا محوِ مطالعہ و شاعری ان دو چیزوں سے الگ ہو کر جب وہ اس بے ثبات دنیا میں قدم رکھتے تھے تو بے قراری اور اضطراب ان کا دامن پکڑتی تھی۔ دنیا اور دنیاداری نے کبھی ان کو سکون میسر نہ کیا۔ اسی لئے وہ آہستہ آہستہ اس خودغرض دنیا سے الگ ہی ہونا پسند کرتے تھے۔ تنہائی ان کا ساتھی، شاعری ان کی غذا، خطوط نویسی ان کا شغل، عبادت خدا اُن کا لباس، قرآن خوانی اُن کی راحت اور مطالعہ ان کی نیند تھی۔ ہمیشہ اُن کے کمرے سے رات کے سناٹے میں خوفِ خدا سے رونے کی آوازیں آتی تھیں۔ جس سے ان کے کمرے کے ملحق سوتے ہوؤں پر بھی ایک اضطراری کیفیت طاری ہونا

ناگزیر تھا۔

جناب جے پوری صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تنگدستی اور مفلوک الحال میں گذاری۔ وہ صرف اس لئے کہ انہوں نے کبھی پیسے کی قدر نہ کی بلکہ نہایت محنت اور مشقت سے کمایا ہوا پیسہ سخاوت اور اہل وعیال کی کفالت کے علاوہ کتابوں کی خریداری میں بے تحاشہ صرف کرتے تھے۔ اُن کی مفلوک الحالی اتنی حسین اور دلکش تھی کہ امیری اور دنیاداری شرمندہ ہورہی تھی۔ مجھے کبھی اپنے مخصوص انداز میں ٹھہرنے کا حکم کرتے تھے یہ کہہ کر "آج میرے گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے"۔

اس عجیب وغریب خواہش پر میرا دِل مچلتا تھا اور میں ٹھہرنے میں سعادت سمجھتا تھا۔ پھر رات گئے تک ان کے ساتھ ادبی اور علمی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اکبر جے پوری صاحب کا طرزِ گفتگو اور لب ولہجہ سامع کو ضرور اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ان کی زندگی کے گزرنے والے لمحات ان کیلئے انمول ہوا کرتے تھے۔ اور کھانے پینے کی فکر سے بے نیاز ہوکر محوِ گفتگو ہوا کرتے تھے۔ ویسے بھی اُن کی غذا بہت معمولی ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد بھی تھی۔ گھی اور شکر کے ساتھ ذرا سے چاول ملا کر کھانے میں اُن کو لطف حاصل ہوتا تھا۔ میوے اور دودھ اُن کی غذا میں شامل ہونا لازمی تھا۔ گوشت کو برائے نام ہاتھ لگاتے تھے۔ دن میں چار پانچ دفعہ اپنی بہو بیٹیوں سے پورے ادب واحترام کے ساتھ چائے کی فرمائش کرتے اور پہلی ہی چسکی لیتے ہی ناک بھوں چڑھا کر

دبی زبان میں کہتے "یہ پینے کے لائق نہیں ہے" اُن کے سامنے چائے کی پیالی رکھ کر ہم لوگ صرف اسی جملے کو سننے کیلئے منتظر رہتے تھے۔ اکثر چائے کی پیالی کو رکھ کر محوِ مطالعہ ہوا کرتے تھے یہاں تک کہ چائے ٹھنڈی ہو جاتی تھی۔ ہر کھانے پر اُنہیں تھوڑی سی کھانڈ کھانے کی عادت تھی۔ کھانے کے بعد ہاتھ صاف کرتے ہیں "تھوڑی سی شکر" کی آواز لگاتے۔ ذرا سی دیر ہونے پر ضرور کہتے کہ مجھے قید میں اس طرح شکر کیلئے انتظار نہ کرنا پڑتا تھا۔

جے پوری صاحب اپنے بچوں کی خاطر ہمیشہ فکر مند رہتے تھے۔ اور اُن کی صحت اور خوشحالی کے لئے ہر نماز میں گڑگڑاتے دُعا کرتے تھے۔ لیکن اپنی سب سے چھوٹی بیٹی نسرین فاطمہ جسے وہ ہمیشہ نسرین باجی کے نام سے پکارتے تھے حد سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ اُس کا چہرہ دیکھنے اور کم از کم آواز سُننے کیلئے ترستے رہتے تھے۔ اگر کوئی بھی گھر کا فرد نسرین کے ساتھ ذرا سی سختی کے ساتھ پیش آتا تھا تو جناب جے پوری صاحب اس سلوک کو ظالمانہ اور "طمانچہ شمر بر رخسار سکینہؑ" سمجھتے تھے اور نسرین کے ساتھ ذرا سی سختی دیکھتے ہی اُن کی آنکھیں نمدار ہو جایا کرتی تھیں۔

وہ ہمیشہ مطمئین نظر آتے انہوں نے پوری زندگی میں رات کو سو کر گھر کے دروازوں کی کنڈیاں کبھی بند نہیں کیں۔ اور اس بات پر مسکراتے تھے ان کے اطمینان اور خدا پرستی کی دلیل اس سے اور کیا ہو سکتی ہے کہ جائے نماز پر برائے خواندن نماز کھڑے ہو کر انہوں نے اپنے ایک بیٹے سلیم عباس کے خطرناک

حادثے کی خبر سُنی اور انہیں ذرا بھی لغزش اور بے قراری نہ ہوئی۔ بلکہ پورے اطمینان اور سکونِ قلب کے ساتھ نماز ظہرین ادا کی اور پھر دُعا کی جس کی ہی وجہ سے مزکورہ لڑکا دوبارہ زندگی پا سکا۔ ورنہ ڈاکٹر اس کا آپریشن کر کے انگشت بدنداں تھے۔ اور اس کی شفاء معجزے سے کم نہیں تھی۔

اکبر جے پوری صاحب سادہ تھے اُن کی زندگی سادہ تھی ان کا رہن سہن سادہ تھا اور ان کی پوشاک سادہ یہاں تک کہ انہیں جو پہنے کو دیتے خوش ہو کر پہنتے۔ کبھی بھی کوئی چیز ناپسند نہیں کرتے۔ بلکہ شُکرِ خدا میں ممنون اور احسان مندر ہتے تھے۔ ہر مہمان اور ہر ملنے والے کو جھک کر سلام کرتے تھے۔ اُن کے پاس ذات پات، اونچ نیچ اور عمر کی کوئی تمیز نہ تھی۔ وہ اپنے شاگردوں سے بھی بلا امتیاز والہانہ محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ مجھے کبھی سلام کرنے کا موقعہ ہی نہ دیتے بلکہ دیکھتے ہی ہاتھ اور جبیں کے اشارے سے سلام کر کے مجھے عرق میں شر پور کرتے اور مجھے سینے سے لگا کر ہاتھ چوما کرتے تھے۔

کئی دفعہ میں ان کے احترام میں قیلولہ سے اُٹھنے لگا تو انہوں نے مجھے پوری شفقت اور محبت کے ساتھ کاندھوں سے پکڑ کر سُلا دیا۔ یہ کہہ کے کہ "میں آپ کو ڈسٹرب کرنے نہیں آیا"۔ میری حالت کا آپ خود اندازہ کیجئے کہ مجھے لیٹے رہنا اور میرے سرہانے میرے شفیق اُستاد اور باپ بیٹھے رہتے تھے۔

بہارِ زندگی میں شاخِ گُل کی طرح لہراتا ہوا جے پوری صاحب زندگی کی خزاں میں آتے آتے ادبی دنیا کے ایک تناور درخت کی حیثیت کر گئے اور اردو

ادب کی مختلف صنفوں پر اپنا زورِ قلم آزماتے رہے۔ وہ کشمیری ہوتے ہوئے اردو زبان کے ماہر اُستاد اور ہمدرد تھے۔ اُن کی قیام گاہ میں اُن کی بے لوث کاوشوں کے پھل کی صورت میں ادبی ذخیرہ الماریوں کی زینت بنا ہوا ہے۔ اور تشنۂ اشاعت ہے۔ ان کے کلام میں مرثیہ اور نوحہ کا اہم مقام ہے۔ جس سے اُن کے حسینیؑ دیوانہ ہونے کی شہہ ملتی ہے۔ وہ نام حسینؑ سے پسیج جاتے تھے اور غمِ حسینؑ میں بہنے والے آنسو ان کے خوب صورت چہرے کو جلا دیتے تھے۔ دس پندرہ سال سے صاحب فراش ہونے کے باوجود محرم الحرام کا چاند نظر آتے ہی اُن کے بدن سے تمام دُکھ درد کوسوں دور بھاگتے تھے اور اُنہیں حسینیؑ خدمت کرنے کا پورا پورا موقعہ فراہم کرتے تھے۔ وہ اپنی تنخواہ اور قلیل پنشن کا بیشتر حصہ حسینیت کے فروغ کیلئے خرچ کرتے تھے۔

جناب اکبر جے پوری صاحب بڑے مہمان نواز، مخلص اور منکسر المزاج تھے۔ پورے لکھنوی انداز میں ہر مہمان کا سواگت کرتے تھے اور پوری قوت خلوص کے ساتھ محوِ گفتگو ہوتے۔ گھر کے ہر فرد کے ساتھ بلا امتیاز شفقت سے پیش آتے تھے۔ عید سے پہلے ہی چند روز گھر کے بچوں اور گھر کے باہر والے بچوں کو عیدی دینے کی تیاری میں لگے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اُدھار پیسے لے کر بچوں کی فرمائش پوری کرتے تھے۔ ان کی بچوں کے تئیں شفقت کی حد یہ تھی ہسپتال میں بسترِ مرگ سے بھی پیسے بھیج دئے کہ بچوں میں تقسیم کئے جائیں۔

اکبر صاحب کی پوری ازدواجی زندگی اور اپنی شریک حیات سے نبھاہ کا ایک

مکمل نقشہ اُن کا یہ شعر پیش کرتا ہے ؎

میرے سکون کی دشمن ہے تیری ہر آہٹ
تیرا خیال بھی آئے تو بے قرار کرلے

اکبر جے پوری صاحب کی دنیا سے بیزاری اور نفرت کے بغور مشاہدہ کر کے لڑکپن میں ہی اُن کے بڑے بیٹے سید شبیر حسین نے گھر کی ہر ذمہ داری سنبھالی اور اپنے والد محترم کو اپنے مشاغل میں محو رہنے کی مکمل آزادی فراہم کی۔ خرچ دار کنبے کا بھاری بوجھ سمبھالنے کے ساتھ ساتھ شبیر صاحب کی کڑی نظر والد صاحب کی ہر ضرورت اور احتیاج پر رہتی اور کسی بھی طرح اُن کی ضرورتوں اور خواہشوں کو پورا کرنا اُن کا اولین فرض ہوا کرتا تھا۔

میں نے شبیر صاحب کو اپنے والد محترم کے ساتھ کبھی بھی کھل کے اور بے باک انداز میں محوِ گفتگو نہ دیکھا بلکہ والد محترم کی ہر بات کا جواب ہاں یا نا میں دیتے رہتے۔ اِن دونوں کے درمیان حیا داری اور شرافت کا پردہ سا حائل دِکھتا تھا۔ جو اُس وقت سِرک گیا جب موت سے کئی گھنٹے پہلے جے پوری صاحب دنیا کی ہر شئے اور ہر مصروفیت سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے بچوں کے باپ رہ گئے اور شبیر صاحب مجسمہ شفقت بن کر اُن کے حسین چہرے اور گھنگریالے بالوں پر نرم نرم ہاتھ پھیرتے ہوئے نظر آئے اور فرشتہ موت تھوڑی دیر کیلئے رُکا رہا۔

〈سید محمد مصروفؔ〉
ڈب گاندبل
۱۵ / اپریل ۱۹۹۸ء

Akbar Jaipuri: Poet who refused to compromise

By Rajesh Singh,

(Senior Editor Pineer, New Delhi)

(15th March, 2001)

Yeh Hamara Hain. Rajasthan Ke Nahin.

This is how the Kashmiri leader, Bakshi Ghulam Mohammad hailed Akbar Jaipuri when the poet was called on stage at a mushaira in Kashmir and introduced to the audience as a shaair from Rajsthan, It was some time in the late fifties.

To the misfortune of the nation, this brilliant Urdu poet remained largely, confined to Kashmir, which was to bestow on him fame on an unprecedented scale and also pain of the severest kind. Both touched him deeply and were reflected in his writings. Many explanations

can be forwarded for his confinement to Kashmir: he did not possess the art of self-promotion; he consistently resisted the temptation of a career in films despite his contacts; he was an uncompromising idealist-poet who refused to seek shelter in 'populist' writing even in the most trying circumstances, uncompromising until the last day he lived. On March 4, 1998, he breathed his last after a long and futile battle with illness.

Only a year before, he had come to Goa on a brief visit to meet his son. Deeply impressed by the dazzle of nature, he remarked that, had he seen the place earlier in life, he would surely have written about its beauty, Jaipuri spent all his time in Goa mediating and writing. Depression had set in.

Akbar Jaipuri was a Kashmiri, no doubt. His love for Jaipur, where he was born and brought up till his early teens, was no less than for his

native land. He would repeatedly remark that, while the charm of the valley was intoxicating, sweet memories of Jaipur refused to go away. He was a decent soul torn between the two. He could not abandon one for the other. His heart was in complete union with both. Bakshi Ghulam Mohammad may have appropriated the 'physical' Akbar Jaipuri for his beloved Kashmir but spiritually the poet had carved his own boundaries of love and compassion that extended well beyond Kashmir.

Primarily recognized as one of the pioneers of Urdu literature in the valley, Jaipuri was also proficient in English, Arabic and Persian. He even taught Hindi and played a major role in promoting the language in the valley in those early days. He was a secularist at heart and fervently believed that exploitation of religion for spreading hatred and unrest was un-Islamic.

He succeeded in projecting this secularism even as he made path-breaking contributions to promote the ideas of Islam through his poetry. He founded the Hussaini Mushaira a platform dedicated to highlight in the most superior fashion the gallantry of the Prophet's grandson, Imam Hussain, and his tragic fate at Karbala.

Akbar Jaipuri was a genius - both as poet and teacher, He went on to write Urdu text - books for schools in Kashmir and other important academic papers that are considered unmatched by Urdu scholars even today.

It was teaching that fetched him income just enough to feed his family. There were, of course, ways and ways to make money. But Jaipuri shunned them contemptuously. Self - dignity was everything to him. He spent sixteen of his prime years of life fighting against the establishment as a teacher, on a matter of

principle. He was ridiculed, threatened, imprisoned and suspended from work. Matters went to the court. But he refused to compromise. Even his friends turned away from him in the time of trouble, prompting him to remark.

Hain purane dushmano ki dushmani se bhi sakht-tar.

Aaj kal kay doston ki dosti mere liye.

(Even more severe than the enmity of old foes/ Is for me the friendship of today's friends.)

Vindication came in the end, but at a cost that many others in his place would have been incapable to bear.

Khud ko jab main shinakht kar na saka

Maine 'Akbar' badal liya chehra.

(Having failed to identify my self/I, 'Akbar' changed face)

Wherefrom this dilemma arose, when Akbar Jaipuri did not have a split personality to trouble him with self-identification? He never did

face-lifts to please the world. It appears more in the realm of fantasy, perhaps just to 'see' how things would seem, had the poet to become a chameleon. The failure to 'identify' Jaipuri rests squarely on those who were unjust to him, those who exploited his genius to further their popularity. When he was struck by penury, Jaipuri did ghost - writing for a number of people including a well - known author whose books continue to be published today.

He acquired instant fame as an Urdu teacher after he was posted at the Teacher's Training College in Srinagar. He was very much loved by students because he completely overhauled the teaching methods. His methods inspired and persuaded several students to take up Urdu seriously and emerge as scholars in their own right. This, at a time when Urdu was still not established in the valley and Kashmiri was the

spoken language. He was a multifaceted teacher. Urdu literature, Islamic literature, Hindi, Persian and Arabic teaching got a new and vigorous impetus under his tutelage. If at all, these were his several 'faces' as a teacher and identification may have been a problem for those who were looking to categorize him.

Sayeed Mohammad Akbar (Akbar Jaipuri) was born on October 23, 1928, in Jaipur in a middle class family. His father was a noted religious preacher. His ancestors came from Hamdaan, Iran, and belonged to the famous Hamdaani family. Jaipuri's forefathers had settled down in Kashmir some 600 years ago. In the twenties, Akbar Jaipuri's family including an uncle came down to Jaipur and established a business there. His father was greatly regarded by the then King of Jaipur, Maharaja Madu Singh who even offered them a Jagir. Jaipuri had his

early education there, passing his middle school examination with distinction and outranking all other students. He also cleared high school in a similar fashion. He participated in several social and co-curricular activities and edited the school magazine. There began developing an interest in writing.

Just as the young Akbar Jaipuri was beginning to blossom as a brilliant student, tragedy struck the family. His father lost Rs.5 lakh in business and could not recover from the loss. In the 40s, the family left for Kashmir. He completed his college education from the Punjab University in Kashmir with flying colours. He completed his graduation in English and joined the Teacher's Training College in Srinagar. Thus began a long and eventful career in academics and literature and a tearful break with Jaipur. Later, when Jaipuri had to turn down an

invitation by his teacher Maulana Athar to visit the Pink City again, it evoked an emotional response from the maulana:

Main Yahaan Jaipur mein huun
Tu wahaan Kashmir mein
Yeh judai bhi likhi thi
Aah! Meri takdir mein.

(I'm in Jaipur/ You're in Kashmir/ Such a separation/ Oh! Was in destiny written)

The maulana's dedication to his beloved students was stupendous. On another occasion, he said that, whenever he recited the azaan - Allah-o-Akbar, he would 'forget' Allah and think of Akbar!

Akbar Jaipuri has four published poetry collections to his credit. They are: Saaz-e-Shikasta, Fikr-o-Fan, Fikr-o-Khayal and Chamanzaar. These contain a range of emotions, from the romantic to realistic. He strongly believed that good poetry could be possible only

with a good subject. In his writings, the subjects were in the form of real-life experiences. Experiences that led to happiness, caused fear, gave rise to self-doubts. Promoted depression and aroused hope.

Jaipuri's poetry reflected the emotions of his heart. He was not out to reform the world by giving a clarion call. Indeed, he was far too an introvert to undertake such a task. Unlike many of his better-known (but not necessarily superior) contemporaries, he did not allow political ideologies to influence his writing. (Perhaps that was another reason why he never could fit in any of the flourishing politico-intellectual clubs of the day that helped promote the literature of its members.) He celebrated through his poetry and he sorrowed through his poetry.

In the evening of life, burdened by the many bitter moments, he turned inward and became

reclusive. His poetry reflected the dangerously depressive mood. A month before he died, he penned his last lines. He was tragedy personified. He ebgan with a call to the Supreme Being.

Allah mere - aaj mujhe kya yeh hua hai

Kaanta sa jigar mein, mere jaise ke chubha hai.

(My Allah - whatever has happened to me / Like a thorn has pierced my heart)

He went on to lament the state of mind:

Ab kabr mein aaj mujhe aaraam milega.

Dukh dard zamane ka hamesha hi saha hai.

(I shall today find peace in the grave/ Having suffered sorrow and pain of this world)

And then the denouement;

'Akbar' se gunehgaar ka dekho ye janaaza

Sharminda hai munh dhaanpe kafan mein jo chala hai.

(Look at the funeral procession of a criminal like 'Akbar' / In shame he hides his face who

goes in the coffin.)

Akbar Jaipuri deserved better in life. As brilliant teacher, Urdu literature of a high caliber and a fine human being, he had few peers. Hopefully, his true worth will be known and appreciated at least now - after his death.

BIKHRAY MUTI

BY

Akbar Jai Puri

اکبر جے پوری سرزمین کشمیر کے اُن گنے چُنے شعراء میں سے ہیں جنہوں
نے اردو شاعری میں اپنے میٹھے لہجے سے ایک الگ مقام بنایا ہے۔ اُن
کی آواز اگرچہ بعض جگہوں پر تھکی تھکی سی معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں
نغمگی اور لوچ برابر قائم ہے۔ اُن کی شاعری میں جہاں پیکر تراشی کے
عمدہ نمونے ملتے ہیں وہاں اُن کا اسلوب لہجے کا انفرادی پن اور بیان کا
سادہ انداز بھی متاثر کرتا ہے۔ اکبر کی شاعری میں خوف، دہشت، شام،
سمندر، موت، خلا، غم، دھواں وغیرہ ایسے بہت سے الفاظ بار بار ملتے ہیں
جنہیں وہ علامتوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اکبر جے پوری غم کے
شاعر ہیں۔ شاید اس کا سبب اُن کی اپنی زندگی ہے۔ اُن کی ذاتی زندگی غم
والم کی ایک کھلی کتاب ہے۔ اس غم والم کو وہ ہنس ہنس کر سہتے ہوئے نظر
آتے ہیں اور یہ اسی غم کا اعجاز ہے کہ اُن کی شاعری میں دردوغم کی آگ
سلگتی ہوئی محسوس کی جاسکتی ہے۔

پریمی رومانی ....

Designed by T.F.C Computers 9419525103